ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابویحییٰ

ستمبر ۲۰۱۹

www.inzaar.pk

September 2019
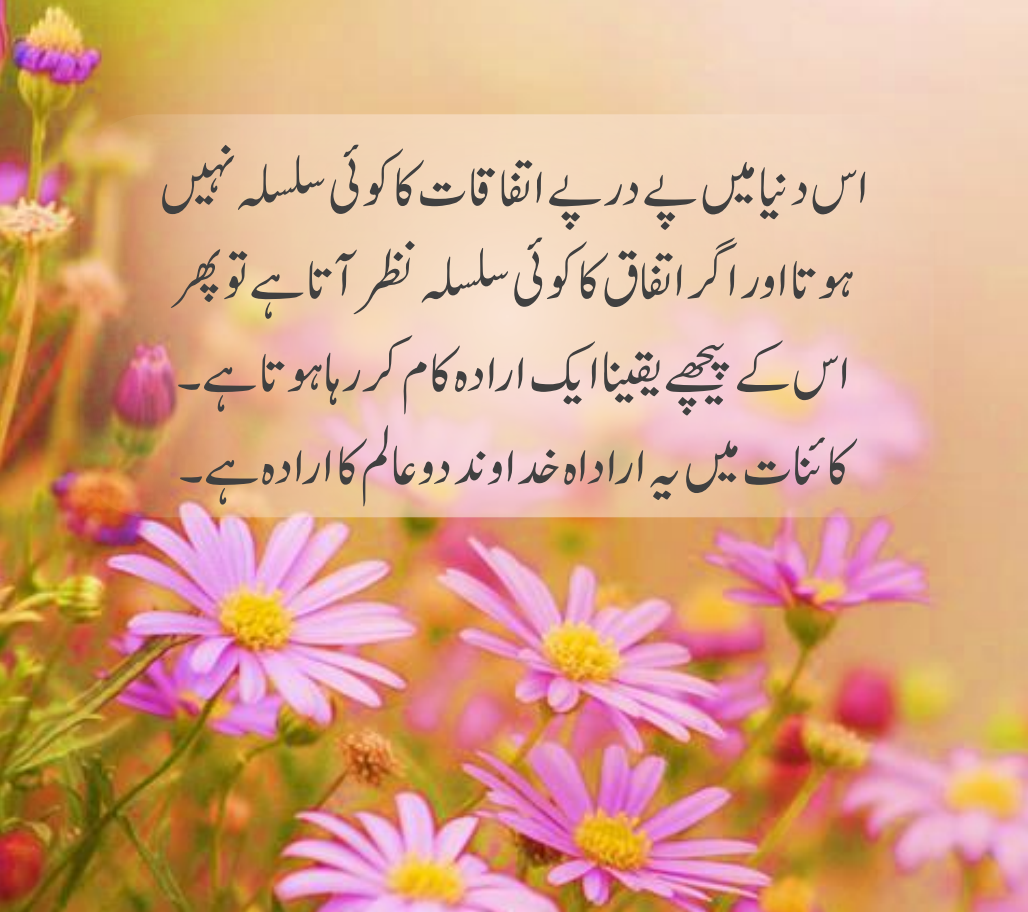
Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: facebook.com/inzaartheorg

Join us on YouTube youtube.com/inzaar-global

WhatsApp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from WhatsApp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to **info@inzaar.org** and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD

ابو یحییٰ کی نئی کتاب

بندگی کے سو رنگ

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''میں نے جن وانس کو اپنی بندگی ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔''، (الذاریات 51:56)

بندگی کی یہ دعوت اپنے اندر اتنے ہی رنگ لیے ہوئے ہے جتنے خود زندگی کے مختلف رنگ، پہلو اور گوشے ہیں۔ پیش نظر کتاب میں زندگی کے ان رنگوں کو بندگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اسی لیے اس مجموعہ مضامین کا نام ''بندگی کے سو رنگ'' رکھا گیا ہے۔

کتاب کا ہر مضمون وہ زاویہ نظر دیتا ہے جو ایک بندہ مومن سے اس کے مالک کو مطلوب ہے۔ چاہے اس کا تعلق زندگی کے فکری پہلو سے ہو یا عملی پہلو سے۔ بندگی کی سوچ مومن کی فکر وعمل کے ہر رنگ کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ بندے کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر رنگ کو مالک کے بنائے ہوئے کینوس (canvas) کے پس منظر میں دیکھے۔

اس طالب علم کو یقین ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد آپ کی زندگی بندگی کے رنگوں میں انشاءاللہ رنگ جائے گی۔ یہی اس کتاب کا مقصد تصنیف ہے۔

ابو یحییٰ

ماہنامہ

اِنذار

ستمبر 2019ء ذوالحجہ/محرم 1441ھ

جلد 7 شمارہ 9

تھائی لینڈ اور آسٹریلیا کا سفر 02

مدیر:
ابویحییٰ ریحان احمد یوسفی

سرکولیشن مینیجر:
غازی عالمگیر

معاون مدیر:
عابد علی، بنت فاطمہ،
سحر شاہ، عظمیٰ عنبرین

معاونین:
محمد شفیق، محمود مرزا

فی شمارہ ــــ 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.pk

تھائی لینڈ اور آسٹریلیا کا سفر

ریسکیو مشن

اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کی بات نہیں مانی جائے گی۔ قوم رسولوں کا انکار کرے گی اور آخر کار عذاب کا شکار ہو جائے گی۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ رسولوں کو قوموں کی طرف کیوں بھیجتے ہیں؟ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب میں سڈنی کے کوگی ساحل کے وسیع و عریض پارک کے ایک گوشے میں بیٹھ کر جمال کو سمجھا رہا تھا۔

آج ایک ماہ طویل تھائی لینڈ اور آسٹریلیا کے دورے کا آخری دن تھا۔ جمال اور فرحان نے اپنے اپنے آفس سے رخصت لی تھی کہ یہ دن میرے ساتھ گزار سکیں۔ ایک اور دوست احتشام بھی ساتھ تھے۔ جبکہ میرے میزبان عاطف تو پہلے ہی سے کئی دن کی چھٹی لے کر میری وجہ سے گھر بیٹھے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ مجھے لے کر سڈنی کے اس علاقے میں آئے تھے جو سڈنی کا مہنگا ترین علاقہ تھا جہاں زیادہ تر یہودیوں کی آبادی تھی۔ کوگی کا یہ بیچ نصف دائرے میں بنا ہوا خوبصورت ساحل سمندر تھا جہاں سے تا حد نظر دور تک پھیلا نیلا پانی اور اس کے اوپر نیلگوں آسمان اپنے بنانے والے کی حمد اس کی تسبیح کے ساتھ اس طرح کر رہا تھا کہ دیکھنے والے اگر صاحب نظر ہوں تو خود کو ان کا ساتھ دینے پر مجبور پاتے۔ اور اگر صاحب دل ہوں تو زمین، آسمان و سمندر ان کے ساتھ مل کر خدا کی حمد کو اپنے لیے باعث اعزاز سمجھتے ہیں۔

خدا کی صناعی کو انسانوں کی محنت نے اور دل کش بنا رکھا تھا۔ ساحل کے ساتھ ایکڑوں تک پھیلا ہوا یہ ایک بہت بڑا پارک تھا جس کی سبز گھاس ایک مخملی ریشم کی طرح نگاہوں کو بھلی لگ رہی تھی۔ ہم نے جہاں گاڑی پارک کی تھی اس جگہ سے چلتے ہوئے ہم بہت دور آ چکے تھے۔ واپس جانے کی ہمت کم از کم میری نہ تھی۔ جمال نے بمشکل تمام مردِ مجاہد فرحان کو یہ بات سمجھائی تھی کہ

ریحان بھائی پیدل چلنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ جس کے بعد باقی دوست تو گاڑی لینے چلے گئے اور میں جمال کو اس سوال کا جواب دینے لگا جو اوپر بیان ہوا ہے۔

مسئلہ یہ تھا کہ اگر ہدایت بھیجنے کا آخری نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ لوگ نہیں مانیں گے اور ان کے انکار کے نتیجے میں عذاب آجائے گا تو بہتر ہے کہ ہدایت کو بھیجا ہی نہ جائے۔ یہ وہ سوال تھا جس نے برسوں مجھے بھی پریشان کیے رکھا تھا۔ آخرکار اس سوال کا جواب خود قرآن ہی نے دیا۔

جواب یہ تھا کہ رسول اسی وقت بھیجے جاتے ہیں جب دل کا جانا ٹھہر جاتا ہے۔ یعنی جب کوئی قوم اپنے اعمال کی بنا پر قوموں کے عروج و زوال کے عمومی قانون کی بنیاد پر تباہی کی مستحق ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کو دعوت اور ہدایت کی گھٹا بنا کر اس سرزمین پر برسنے کا حکم دیتے ہیں۔ قوم کی زمین اکثر اس درجہ پتھریلی اور دل اس درجہ پتھر دل ہو جاتے ہیں کہ یہ ابر رحمت اس پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آخرکار قوم کسی زلزلے، کسی سیلاب، کسی طوفان، کسی آندھی اور کسی کڑک کا شکار ہو کر تباہ ہو جاتی ہے۔

مگر اس دعوتی عمل کے دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ لوگوں کے پاس اب یہ عذر باقی نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بھیج کر بالکل صاف صاف اپنا پیغام کیوں نہیں پہنچایا۔ یہی اتمام حجت کا وہ عمل ہے جو سرانجام دینے اللہ کے رسول آتے ہیں۔ اس کا ثانوی اور ایک دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ لوگ اس ڈوبتے جہاز سے اتر کر رسولوں کی اس کشتی میں بیٹھ جاتے ہیں جو آنے والے عذاب الٰہی کے طوفان سے بھی بچالی جاتی ہے۔ چنانچہ پوری قوم نہ سہی مگر کچھ لوگوں کے لیے یہ دعوتی کام وہ ''ریسکیو مشن'' بن جاتا ہے جو ان کی دنیا اور آخرت کو تباہ ہونے سے بچالیتا ہے۔ ان کے لیے میری یہ بات آج کی نشست کا ٹیک اوے بن گئی۔

جمال کے لیے جو بات اس نشست کا حاصل تھی وہ میرے لیے حاصل زندگی ہے۔ دعوت

دین کا کام اگران لوگوں کوسامنے رکھ کر کیا جائے جو بات سنتے ہی نہیں یاسن کرنہیں مانتے تو داعی کا دل بیٹھ جائے گا۔مگرنظران لوگوں پر رہے جو چاہے تعداد میں کم ہوں ،مگر بات سنتے اور سمجھتے ہوں تو انسان کوزندگی اس کام میں لگا کر زیاں کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔زیاں تو خیراس کام میں کبھی نہیں ہوسکتا کہ ایمان واخلاق کی نبوی دعوت کا آخری نتیجہ جنت کی ابدی بادشاہی ہے۔

مگرانسان انسان ہے۔وہ یہ دیکھتا ہے کہ مادی دنیا میں نتیجہ کیا نکل رہا ہے۔وہ تبدیلی چاہتا ہے۔اوراگرایک داعی اس احساس میں جینے لگے کہ اسے دنیا بدلنی ہے تو اس کے حصے میں سوائے مایوسی کے کچھ نہیں آئے گا۔لیکن یہ معلوم ہوجائے کہ وہ ایک ریسکیومشن پر ہے تو پھر وہ دنیا بدل دینے کے مشن امپوسیبل سے اپنا دھیان ہٹا کر افراد پر توجہ کرتا ہے اور ایک شخص کا بچالینا بھی اسے بہت بڑی بات محسوس ہوتا ہے۔دعوت کا کام ایسا ہی ریسکیومشن ہے اور کچھ نہیں۔

پرانا بینکاک نیا بینکاک

سڈنی کا وہ دن میرے اس طویل سفر کا آخری دن تھا جو تقریباً ایک ماہ پہلے شروع ہوا تھا۔میرے سفر کے پڑاؤ کی پہلی منزل بینکاک تھی۔میں دنیا کے اس حصے میں ہونے والے اپنے پہلے کیے جانے والے متعدد اسفار میں براستہ بینکاک ہی آگے گیا تھا۔مگرصرف ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں بینکاک شہر کے اندر گیا تھا۔یہ 2008 کا وہ سفر تھا جس میں میں ملائیشیا،سنگاپور کے بعد بینکاک آیا تھا۔اس سفر کی روداد بھی میں نے قلمبند کی تھی جو اب میرے سفرنامے ''کھول آنکھ زمین دیکھ'' کے آخر میں شامل ہے۔

بینکاک کا وہ سفر بڑی دل گرفتگی کے ساتھ ختم ہوا تھا۔وہاں بنت حوا کوسر بازار اتنا سستا بکتا دیکھ کر دل بجھ گیا تھا۔میں بینکاک پر ''ریڈ لائٹ سٹی'' کی ہیڈنگ لکھنے کے علاوہ کچھ اورنہیں لکھ سکا تھا۔ماضی میں ایسی کیفیات سے گزرنے کے بعد میرے پاس تھائی لینڈ جانے کی کوئی خاص وجہ

نہ تھی۔ مگر اہلیہ کا اصرار تھا اور آسٹریلیا جاتے ہوئے یہ منزل راستے میں پڑتی تھی اس لیے قدرے بے دلی کے ساتھ اس سفر پر آمادہ ہوا۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ جب میں وہاں پہنچوں گا تو ایک نیا بینکاک میرا منتظر ہوگا۔ نئے تجربات اور نیا زاویہ نظر میرے رب کو مجھے عطا کرنا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر دو روشن چہرے ہمارے منتظر ہوں گے جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اس سفر کو ایک بالکل مختلف سفر بنا دیا۔

جنگ نہ ہو کر بھی ایک المیہ ہے

تھائی لینڈ جانے کا کوئی دل نہ تھا۔ اس پر مزید یہ المیہ ہوا کہ راستے میں پڑنے والی ہندوستانی کمرشل ائیر اسپیس پاکستان سے آنے والے جہازوں کے لیے بند تھی۔ یہی معاملہ برعکس بھی تھا کہ پاکستان کی ائیر اسپیس بھی بھارت سے آنے والے کسی بھی جہاز کے لیے بند تھی۔ اس کا سبب چند ہفتے قبل فروری 2019 میں بھارت اور پاکستان کے درمیان شروع ہونے والی سخت کشیدگی تھی جس میں نوبت جنگ تک آ پہنچی تھی۔

مسئلہ وہی پرانا تھا۔ بھارت میں ایک دہشت گرد حملہ اور اس کے جواب میں بھارت کی طرف سے سخت ردعمل۔ اس دفعہ صورتحال باقاعدہ فضائی جھڑپ اور اس کے بعد میزائل حملوں کے ریڈ الرٹ تک پہنچ گئی۔ بھارت اور پاکستان کے اہم شہر ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ میزائل حملوں کی شکل میں سنبھلنے کا موقع بھی نہیں مل سکتا۔ چنانچہ دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کی ائیر اسپیس بند کر دی تھیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فضا میں کوئی چیز ایک دوسرے کی طرف آتی ہوئی نظر آئے تو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ کوئی کمرشل فلائٹ ہے بلکہ یقینی طور پر اسے دشمن کا میزائل یا جہاز سمجھا جائے اور اپنے دفاعی نظام کو پہلے ہی سے اس سے نمٹنے کے لیے تیار کر دیا جائے۔

جنگ تو اللہ کی عنایت سے نہیں ہوئی مگر اس پابندی کے نتیجے میں سفر کرنے والے مسافروں کے لیے بہت مسائل پیدا ہوگئے۔ بہت سی فلائٹ کینسل ہوئیں۔ لوگوں کو بہت تاخیر کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے لوگ بے چارے ائیر پورٹ پر پریشان رہے۔ یہ سلسلہ تادم تحریک یعنی ماہ جولائی تک جاری ہے اور سفر کرنے والے بہت سے مسائل کا سامنا کررہے ہیں۔

جنگ اتنی بری چیز ہے کہ اس کے قریب آنے سے بھی لوگ اذیت میں آجاتے ہیں۔ اس خطے کے لوگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے ہاں جنگوں کو بہت زیادہ گلیمرائز کیا جاتا ہے۔ مگر عملی طور پر انھوں نے ابھی تک نہ کوئی جنگ دیکھی ہے اور نہ جنگ کی تباہی سے معمولی درجہ میں بھی واقف ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ بستیاں جب قبرستان بنتی ہیں، شہر جب شمشان گھاٹ بنتے ہیں، جان، مال، آبرو جب بے وقعت ہوتی ہے، بربادی جب ڈیرے ڈالتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔ یورپ نے دو جنگوں میں مکمل تباہی کے بعد یہ سبق سیکھ لیا تھا اور وہ آج تک جنگ سے بچتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ ہماری قوم یورپ کی طرح یہ سبق مکمل تباہی سے پہلے سیکھ لے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہندوستان کے ارب سے زائد باشندے ہمارے مدعو ہیں جن تک توحید کا پیغام پہنچانا اور اسلام کی فلاح کا راستہ دکھانا ہماری ذمہ داری ہے۔ ہمیں اس پہلو سے بھی جنگ اور تنازعات سے بچنا چاہیے۔ جنگ تو ایک بربادی کا نام ہے اور کچھ نہیں۔ یہ ہوجائے تو المیہ ہے اور نہ ہو تب بھی المیہ ہے۔

بینکاک براستہ دبئی

ائیر اسپیس کے مسئلے کی وجہ سے ہماری فلائٹ کینسل ہوگئی۔ اس بنا پر پروگرام ڈسٹرب ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ ایمرجنسی میں ایک دن پہلے کی فلائٹ کرانی پڑی۔ ہوٹل بھی ایک دن پہلے کا بک کرانا پڑا۔ اور سب سے بڑھ کر فلائٹ کا دورانیہ طویل ہوگیا۔ تھائی ائیر ویز کا ہمارا جہاز سیدھا

جانے کے بجائے پہلے الٹی سمت دبئی کی طرف گیا اور پھر وہاں سے ہندوستان کی حدود سے ہوتا ہوا تھائی لینڈ پہنچا۔

اس پر مزید معاملہ یہ ہوا کہ ائیر پورٹ پر ہمارے دوست ڈاکٹر عامر گزدر صاحب کا فون آ گیا۔ وہ ملائیشیا میں مقیم ہیں وہیں سے اپنا پی ایچ ڈی مکمل کیا ہے۔ ان کا یہ مقالہ خود اپنی ذات میں بہت غیر معمولی علمی کام ہے جس میں پردے کے حوالے سے اسلاف اور معاصر اہل علم کے تمام نمائندہ مکتبہ ہائے فکر کا تقابلی مطالعہ کر دیا گیا ہے۔ اسے پڑھ کر ہر شخص یہ جان سکتا ہے کہ اسلاف اور معاصرین کی پردے کے حوالے سے مختلف آیات و احادیث کی روشنی میں کیا رائے ہے۔

عامر صاحب نے بتایا کہ وہ پچھلے برس تھائی لینڈ گئے تھے۔ مگر ان کو تھائی لینڈ کسی بھی پہلو سے بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ ان کے نزدیک وہاں جانا وقت اور پیسے دونوں کا زیاں تھا۔ ان کے تاثرات سننے کے بعد اس سفر کے لیے کوئی جوش تھا تو وہ بھی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ تاہم اس وقت مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس سفر کو ایک بہترین سفر بنانے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا آغاز سفر کے شروع ہی میں ہو چکا تھا۔ ہماری فلائٹ کینسل ہونے کے بعد ہمیں صبح آٹھ بجے کی فلائٹ ملی تھی۔ اس فلائٹ میں جاتے تو رات بھی جاگتے میں گزرتی اور اگلا دن بھی رت جگے کی وجہ سے بے کار جاتا۔ تاہم اللہ نے کرم کیا تھائی ائیر ویز نے ایک ایکسٹرا فلائٹ چلا دی۔ وقت بھی بہت مناسب چار بجے شام تھا۔ ہمیں اسی میں سیٹ مل گئی۔

خدا کی نعمتیں اور اس کی نگرانی

جہاز کا سفر بھی بہت آرام دہ گزرا۔ یہ ایک بڑا بوئنگ تھا جس میں دونوں طرف تین تین نشستیں تھیں اور بیچ میں چار نشستیں تھیں۔ ان میں سے بیشتر خالی تھیں۔ چنانچہ زندگی میں پہلی

دفعہ میں نے جہاز میں لیٹ کر سفر کیا۔ زمین سے تقریباً بارہ کلومیٹر بلند فضا میں اڑتے جہاز میں لیٹ کر جھولا لیتے ہوئے سفر کرنا ایک بڑا عجیب تجربہ تھا۔ باہر کا درجہ حرارت منفی پچپن ڈگری تھا مگر اندر فضا انتہائی خوشگوار تھی۔ جہاز کی رفتار 937 کلومیٹر فی گھنٹہ تھی۔ مگر جہاز اتنی روانی سے تیر رہا تھا کہ اس کی حرکت کا احساس کرنا مشکل تھا۔ میرے لیے یہ خدا کی بے پناہ طاقت، قدرت اور رحمت کا عجیب تعارف تھا جس نے اس کائنات کے بعد ایسی آرام دہ اور تیز رفتار سواریوں کو انسانوں کے لیے مسخر کر دیا۔ لوگ اسے سائنس کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ جبکہ یہ سر تا سر اس خدا کی عنایت ہے جس نے کائنات میں یہ پوٹینشل رکھا ہے کہ ہزاروں ٹن وزنی جہاز لطیف ہوا کے کندھوں پر ایسے اطمینان سے چلتا ہے کہ خبر ہی نہیں ہوتی کہ ہم فضا میں ہیں یا زمین پر۔

خدا نے اس دنیا میں انسانوں کو ان گنت نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ جہاز کو چھوڑیے کہ ہر شخص اس میں نہیں بیٹھ سکتا، اپنی ٹانگوں کو ہی لے لیجیے۔ اگر یہ ٹانگیں نہ ہوں تو زندگی کتنی مشکل ہو جائے۔ اس نے یہ نعمتیں اس لیے دی ہیں کہ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہے جو نعمت پا کر اس کا شکر ادا کرتا ہے اور کون ہے جو ناشکری، غفلت اور سرکشی کا شکار ہو جاتا ہے۔ خدا یہ سارا انتظام کر کے غافل نہیں ہو گیا بلکہ وہ ہر لمحے انسانوں کی نگرانی کر رہا ہے۔ ان کے ایک ایک عمل کو نوٹ کر رہا ہے۔ اور ایک دن آئے گا جب وہ لوگوں کی پوری زندگی کے احوال ان کے سامنے رکھ کر بتا دے گا کہ کس نے کیا کیا تھا۔

اس نگرانی کی ایک تمثیل اس سفر میں اس طرح سامنے آئی کہ دوران سفر مجھے یہ پتہ چلا کہ چاہے موبائل انٹرنیٹ سے منسلک نہ ہو تب بھی جی پی ایس کے ذریعے سے میرا موبائل گوگل میپ پر میری لوکیشن بتا رہا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ صارف چاہے اپنے انٹرنیٹ کو بند کر دے موبائل بنانے یا سافٹ ویئر فراہم کرنے والی کمپنیاں اس کی نقل و حرکت سے مطلع رہتی ہیں۔

انسانوں کے بنائے ہوئے اس نظام سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح ہمارا رب ہماری زندگی کی ایک ایک نقل وحرکت سے واقف رہتا ہے۔ ہم ساری دنیا کی نگاہوں سے چھپ جائیں خدا کے علم اور نگرانی سے ہمیں کوئی نہیں بچاسکتا۔ مجھے یاد آ گیا کہ ایک دن قبل میں عشا پڑھنے گیا تو امام صاحب نے سورہ زلزال پڑھی تھی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتادیا ہے کہ جس نے رائی کے دانے کے برابر کوئی نیکی یا برائی کی وہ روزِ قیامت اسے دیکھ کر رہے گا۔ یہ سب کچھ نگرانی کے اس نظام کی بنا پر ممکن ہے جو فرشتوں کے زیرِانتظام اس وقت مکمل طور پر جاری وساری ہے، مگر ہمیں اس کی خبر نہیں ہوتی۔

دنیا کا جوڑا

اسی دوران میں سورج ڈوبنے لگا۔ڈوبتا ہوا سورج اگر فضا سے دیکھا جائے تو بہت خوبصورت نظارہ پیش کرتا ہے۔ میں نے غور کیا تو دیکھا کہ سورج ڈوبنے کے ان حسین لمحوں میں تین عجیب باتیں ایک ساتھ ہورہی تھیں۔ افق پر زمین وآسمان مل رہے تھے۔شام کے پردے پر دن اور رات اور اندھیرا اور اجالا مل رہا تھا۔ میں نے نیچے نظر ڈالی تو سمندر زمین سے مل رہا تھا۔ میں چونکہ مسلسل نقشہ دیکھ رہا تھا اس لیے مجھے یہ اندازہ ہوگیا کہ ہم اس وقت بحیرہ عرب سے ہندوستان میں داخل ہورہے ہیں۔

غروب آفتاب کے اس حسین منظر کے ساتھ یہ تینوں چیزیں ایک ساتھ دیکھ کر مجھے قرآن مجید کا ایک استدلال یاد آیا جو روز قیامت کے حوالے سے وہ پیش کرتا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر چیز ایک جوڑے کی شکل میں بنائی ہے۔ جیسے مرد عورت کا جوڑا، دن رات کا جوڑا وغیرہ۔ جوڑے کا ہر رکن دوسرے کے بغیر ادھورا ہے اور اس سے مل کر ہی اپنا مقصد پورا کرتا ہے۔ جیسے مرد عورت مل کر ہی انسانیت کے سفر کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس لمحے مجھے یہ لگا کہ یہ

تینوں جوڑے یعنی دن ورات، زمین وآسمان اور دھرتی اور سمندر آپس میں مل کر یہ پیغام دے رہے ہیں دنیا اپنے جوڑے یعنی آخرت کے بغیر بالکل ادھوری ہے۔ آخرت کی سزا و جزا کے بغیر دنیا کا امتحان ایک کارِعبث ہے۔ اس دنیا کا یہی ادھورا پن بتاتا ہے کہ قیامت کا دن آ کر رہے گا جب دنیا کے امتحان میں سرخرو ہونے والوں کو ان کا رب جنت کی شکل میں بہترین بدلہ عطا کرے گا۔ وہاں اس غروب آفتاب جیسے ہزاروں حسین مناظر اور ہوائی جہاز جیسی ہزاروں بے مثال نعمتیں انسانوں کی منتظر ہیں۔ مگر وہ انسان کہاں ہیں جو جنت کے امیدوار ہوں۔ اس دنیا کے بیشتر انسان تو اپنے رویے سے جہنم کے امیدوار ہیں۔ کاش انسانوں کو کوئی بتا دے کہ زندگی کا سفر بہت جلد آخرت کی ابدی منزل پر ختم ہونے والا ہے۔

پاکستان اور دعوتی ٹورازم

جہاز کے ٹکٹ میں لکھا تھا کہ آٹھ گھنٹے کی فلائٹ کے بعد مقامی وقت کے مطابق رات دو بجے جہاز کو بینکاک پہنچنا تھا۔ مگر جہاز چھ گھنٹے ہی میں بارہ بجے بینکاک پہنچ گیا۔ میں نے جہاز سے اترتے ہی انفارمیشن سے انٹرنیٹ کے استعمال کا طریقہ پوچھا۔ موبائل کو ائیر پورٹ کے نیٹ سے منسلک کر کے اپنے میزبانوں کو اطلاع دی کہ ہم وقت سے دو گھنٹے پہلے پہنچ چکے ہیں۔ وہ بے چارے اپنے حساب سے دو گھنٹے بعد آنے کے لیے تیار تھے۔ جیسے ہی میں نے یہ اطلاع دی وہ ائیر پورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔

ائیر پورٹ پر بہت زیادہ ہجوم تھا۔ دنیا بھر سے فلائیٹیں ہر رنگ و نسل کے لوگوں کو لے کر یہاں آ رہی تھیں۔ تھائی لینڈ برسوں سے سیاحوں میں مقبول ترین منزل ہے۔ ہر برس کروڑوں سیاح یہاں آتے ہیں اور اربوں ڈالر کی مقامی آمدنی کا سبب بنتے ہیں۔

میرا ہمیشہ سے یہ خواب ہے کہ ہم اپنے ملک پاکستان کو دنیا کا سب سے بڑا ٹورسٹ ملک

بنائیں۔ان کو بہترین سہولیات فراہم کی جائیں۔اوران تمام سہولیات کے ساتھ ان کو قرآن مجید کا سادہ ترجمہ اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان کرتا ہوا ایک احادیث کا مجموعہ دے دیا جائے۔ یہ دعوت دین کا ایک بہت بڑا کام بن سکتا ہے۔ پاکستان میں سیاحت کے اتنے متنوع مقامات ہیں کہ اس کی شاید ہی کوئی نظیر کہیں اور پائی جائے۔کراچی سے گوادر تک پھیلی خوبصورت ساحلی پٹیاں، کے ٹو، نانگا پربت، راکا پوشی اوران جیسی دیگر دنیا کی بلند ترین پہاڑی چوٹیاں، سوات، کاغان، کشمیر، چترال، نتھیا گلی جیسے حسین ترین ہل اسٹیشن اور وادیاں، تھر اور چولستان جیسے گرم اوراسکردو کا سفید اور ٹھنڈا صحرا، دیوسائی کی شکل میں دنیا کی دوسری بڑی اور خوبصورت سطح مرتفع، دنیا کے طویل ترین دریا اور بلند ترین جھیلیں اور ان سب کے ساتھ ہندو، سکھ اور بدھ مذہب کے مقدس مقامات نیز موہن جو دڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا میں موجود دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کے آثار۔ باخدا دنیا کے کسی ملک کے پاس اتنے غیر معمولی سیاحتی مقامات ایک ساتھ جمع نہیں ہیں۔مگر کیا کیجیے کہ اس وقت تو پاکستان مذہبی اور سیاسی انتہا پسندی کے جس چنگل میں پھنس چکا ہے وہاں سے ملک ہی بچ جائے تو یہ معجزے سے کم نہیں ہوگا۔

امیگریشن کی طویل لائن میں ہمارے آگے اور پیچھے ہر رنگ و نسل کے لوگ موجود تھے۔انھیں دیکھ کر میں ایسی ہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ کس طرح ان لوگوں تک خدا اور اس کے دین کا تعارف پیش کیا جائے۔اس وقت تو حال یہ ہے کہ اسلام دنیا بھر میں یا تو دہشت گردی کی ایک علامت ہے یا پھر دیگر مذاہب کی طرح ایک عام دین ہے جس کا معقولیت سے کوئی تعلق نہیں۔دوسری طرف مسلمانوں کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ دین دعوت بنے۔انھیں اجتماعی طور پر دنیا پر اپنا اقتدار قائم کرنے اور انفرادی طور پر اپنی دنیا بنانے سے دلچسپی ہے۔انھی دلچسپیوں کی سزا ہے کہ مسلمانوں پر ذلت اور مغلوبیت مسلط ہے۔

دو روشن چہرے

ہم امیگریشن سے فارغ ہوئے اور پھر اپنا سامان سمیٹ کر دروازے سے باہر نکلے تو تھوڑے ہی فاصلے پر ہمارے میزبان ہمارے منتظر تھے۔ میں نے ان کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگران دونوں کے چہرے اتنے روشن تھے کہ میں دور ہی سے ان کو پہچان گیا۔ یہ بلال اور ماہ رخ تھے۔ان کی ہم سے یہ پہلی ملاقات تھی۔مگر دونوں کے چہرے پر ایسی مسرت اور ہونٹوں پر کھلکھلاتی ہوئی وہ ہنسی تھی جو اپنے کسی عزیز کو دیکھ کر ہی آتی ہے۔ ماہ رخ کے ہاتھوں میں جامنی رنگ کے پھولوں کا گلدستہ تھا۔اس نے بعد میں بتایا کہ یہ مقامی پھول ہیں جو مرجھاتے نہیں ہیں۔

میں بلال سے گلے ملا اور ماہ رخ کو دعا دی۔اس سفر میں ان دونوں نے ہمیں ایک لمحے بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ہم جتنے دن بنکاک میں رکے انھوں نے اپنے آپ کو ہمارے لیے فارغ رکھا۔ان کی محبت اور خلوص وہ سب سے بڑا اثاثہ تھا جو اس سفر میں تھائی لینڈ سے لے کر ہم لوٹے تھے۔

بنکاک کی کشش

بنکاک میں میرے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ بہت سے لوگوں کے لیے تھائی کرنسی بھات کی ان کی کرنسی کے مقابلے میں کم حیثیت اور اچھی کوالٹی کی چیزوں کی بنا پر شاپنگ کے لیے ایک بہترین جگہ ہے۔ کچھ اور لوگوں کے لیے بنکاک اس لیے باعث کشش ہے کہ قابل فروخت چیزوں میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ بدقسمتی سے ان میں بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے۔ بلکہ اس کام کا سب سے معروف علاقہ وہی ہے جو عام طور پر عربوں، پاکستانیوں اور مسلمان سیاحوں کی رہائش کے لیے مشہور رہے۔ یہاں حلال گوشت کے ساتھ ''حرام گوشت'' بھی آسانی سے دستیاب ہوجاتا

ہے۔

مجھ پر یہ انکشاف اپنے پچھلے سفر میں ہوا تھا جب دو دن ایک دوسرے ہوٹل میں رکنے کے بعد ہم نے اپنے قیام میں دو مزید دنوں کا اضافہ کیا تھا اور حلال کھانے کی تلاش میں اور مسلمان سیاحوں کی اکثریت کا علاقہ سمجھ کر اس جگہ منتقل ہوئے تھے۔ اس کے بعد اپنا گریباں چاک کیے اور دوسرے کا دامن چاک کرنے کے مشن پر معمور خواتین کو جگہ جگہ دیکھا۔ جس کے بعد طبیعت پر ایسا بوجھ پڑا کہ یہ دو دن میں نے ہوٹل کے کمرے ہی میں گزارے۔ البتہ میری اہلیہ جس مقصد سے یہاں مزید رکی تھیں، یعنی شاپنگ کرنے وہ انھوں نے خوب کی۔

میں شروع شروع میں ان کے تنہا باہر جانے پر پریشان تھا، مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ معاشرہ بے ہودہ جملہ بازی، چھیڑ چھاڑ اور نگاہوں سے ایکسرے کر لینے جیسے ہمارے ہاں پائے جانے والے ''مردانہ امراض'' سے محفوظ ہے۔ یہ ''امراض خبیثہ'' برصغیر یا عرب کے معاشروں ہی میں پائے جاتے ہیں جہاں اپنی خواتین غیرت کا عنوان اور باقی تفریح کا سامان سمجھی جاتی ہیں۔

ہماری شاپنگ اور ہمارا المیہ

پچھلی دفعہ کی طرح اس دفعہ بھی اہلیہ کی ساری دلچسپی شاپنگ سے تھی۔ مگر یہ شاپنگ اس نوعیت کی نہیں تھی جو عام طور پر باہر جا کر کرتے ہیں اور ڈھیروں پیسے لٹاتے ہیں۔ یہ شاپنگ دراصل گھریلو استعمال کی وہ اشیا جیسے شیمپو وغیرہ ہوتی ہیں جن کی اصل کشش یہ ہوتی ہے کہ خالص شکل میں بغیر کسی ملاوٹ کے مل جائیں گی۔ پاکستان میں مقامی چیزوں کا ملاوٹ سے پاک اور خالص ملنا تو بہت دور کی بات ہے، امپورٹڈ اشیاء کا معاملہ بھی یہ ہے کہ وہ عام طور پر ایکسپائر ہو جانے والی پروڈکٹس ہوتی ہیں جن کی ایکسپائری ڈیٹ مٹا کر نئی ایکسپائری ڈیٹ ڈالی جاتی

ہے۔ پھر یہ ایکسپائر ہوچکی ہوئی امپورٹڈ اشیا پاکستان کے سادہ لوح عوام کو بیچ دی جاتیں ہیں۔

اسی قسم کے وہ حقائق تھے جو میں نے بلال اور ماہ رخ کے سوالوں کے جواب میں ان کے سامنے رکھے جب انھوں نے یہاں کے ماحول پر مجھ سے سوال کیا۔ میرے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ یہاں بے حیائی کی ایک ہی قسم پائی جاتی ہے۔ جبکہ میں جس ملک سے آرہا ہوں وہاں بے حیائی کی ہر قسم پائی جاتی ہے۔ میں بے حیائی کو اسی جامع مفہوم میں استعمال کررہا ہوں جس مفہوم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ اذا لم تستحی فاصنع ما شئت ۔ جب تم حیا نہ کرو تو جو دل چاہے کرو۔ یہی ہمہ گیر بے حیائی ہمارا اصل المیہ ہے۔

اس المیے کو ایک اور سادہ مثال سے سمجھیں ۔ ڈاکٹر عامر گزدر صاحب جن کا ذکر اوپر گزرا ہے، ایک دن مجھے بتانے لگے کہ ان کے سپروائزر پاکستان کی جامعات سے آنے والے تھیسز کو جانچتے ہیں۔ یہ وہ اہم عمل ہوتا ہے جس کے بعد طلبا و طالبات کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملتی ہے۔ یہ ایک پروفیشنل جاب ہے جس کی فیس جامعات ان اسکالرز کو دینے کا معاہدہ کرتی ہیں جن کو تھیسز بھیجے جاتے ہیں۔ مگر پاکستانی جامعات ان سے کام لینے کے باوجود ان کو پیسے نہیں بھیجتیں۔ حالانکہ یہ پیسے انھیں اپنے پاس سے نہیں بھیجنے ہوتے بلکہ یہ رقم وہ اسٹوڈنٹ سے ان کی فیس کے ساتھ لے لیتے ہیں۔ جس معاشرے میں جامعات اس سطح پر ہوں وہاں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اخلاقی طور پر کس ذبوں حالی کا شکار ہوگی۔

خیر یہ ماہ رخ کا تجربہ اور مہربانی تھی کہ وہ بچی چن چن کر میری اہلیہ کو ان جگہوں پر لے گئیں جہاں بینکاک میں بہت سستی شاپنگ ممکن ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ مقامی لوگ وہاں سے شاپنگ نہیں کرتے جہاں سے ٹورسٹ کرتے ہیں۔ ٹورسٹ کو نسبتاً مہنگی اشیاء ملتی ہیں۔ یہی بات ہمارے

دوست عامر گزدر صاحب نے ائیر پورٹ پر مجھ سے کہی تھی کہ ہم بینکاک شاپنگ کے لیے گئے تھے، مگر وہاں وہ بھی بہت مہنگی تھی۔ مگر ان کے ساتھ کوئی ماہ رخ نہیں تھی جو ہمارے ساتھ تھی۔

دین اسلام کا ایک عملی اظہار

بینکاک کے قیام کے چار دنوں میں جب یہ دونوں خواتین مختلف شاپنگ سنٹر کی خاک چھان رہی ہوتی تھیں تو ان کے پیچھے پیچھے میں اور بلال چلتے رہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ سالک کو راہ طریقت میں اپنے مرشد کے سوا کوئی اور نظر نہیں آنا چاہیے۔ اس پہلو سے وہ بینکاک کے اس سفر میں میرے مرشد بنے رہے کہ بیشتر وقت مجھے بلال کے سوا کوئی نظر نہیں آیا۔ کوئی شاپنگ سنٹر، کوئی دکان، کوئی مرد، کوئی عورت مجھے نظر نہ آیا۔ اس کی وجہ تاہم یہ تھی کہ بلال کے پاس ختم نہ ہونے والے سوالات تھے۔ بہت سارے، بہت مشکل اور بہت ذہانت پر مبنی سوال۔ میں سارا وقت ان کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ سوالوں کے جواب دینے کے لیے سوچنا پڑتا ہے اور بولتے وقت مخاطب کو دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے میں سوچتا رہا اور جواب دیتے ہوئے بلال کو دیکھتا رہا۔

چنانچہ ان دو خواتین کے پیچھے ہم دو مردوں نے سوال و جواب کرتے ہوئے اپنا وقت گزارا۔ اس طرح بینکاک کا میرا قیام ایک چلتی پھرتی کلاس بنا رہا۔ مگر اس سے مجھے کوئی کوفت نہیں ہوئی بلکہ بہت خوشی تھی۔ اس لیے کہ سوالات سیکھنے کے ایک بہت گہرے جذبے سے ابھرے تھے جو بلال اور ماہ رخ دونوں میں پایا جاتا تھا۔ اب وہ نوجوان کہاں پائے جاتے ہیں جن کے ذہن میں علمی اور فکری سوالات ہوں۔ جو ہر تعصب سے بلند ہو کر دین سیکھنا چاہتے ہوں۔ جو علم اور عمل اور اس کے نتیجے کے طور پر جنت کی راہ کے مسافر ہوں۔ یہ خوبصورت اور پاکیزہ جوڑا جنت کی اسی راہ کا مسافر تھا۔

انھوں نے ہمارے لیے اپنے گھر سے قریب ایک ہوٹل بک کرا دیا تھا۔ یہ ہوٹل بینکاک کے مشہور سکم وت (Sukhumvit) روڈ پر واقع تھا جس پر بی ٹی ایس (BTS) اسکائی ٹرین بھی چلتی تھی۔ یہ ستونوں پر بلند ریلوے ٹریک پر چلنے والی ٹرین تھی جو بے پناہ ٹریفک جام کے شہر بنکاک میں تیزی سے نقل وحرکت کا سب سے موثر ذریعہ تھی۔ ہم تقریباً روزانہ ان کے ہاں جاتے اور کھانا ان کے ساتھ ہی کھاتے۔ ان کے گھر سے یہاں تک ایک شٹل چلتی تھی جو بلا معاوضہ لوگوں کو بی ٹی ایس کے اسٹیشن تک لاتی لے جاتی تھی۔ ان کا گھر اتنا قریب تھا کہ کئی دفعہ ہم واپسی پر ان کے گھر سے پیدل بھی آئے۔ ماہ رخ نے اس عرصے میں مختلف قسم کے مزیدار کھانے ہمیں بنا کر کھلائے۔ اس کے علاوہ گھمانے پھرانے اور لانے لے جانے کی ساری ذمہ داری بھی انھی کے سر تھی۔ ان دونوں کی وجہ سے بنکاک کسی پہلو سے بھی اجنبی نہیں رہا۔

اس دوران میں بلال نے اپنی شادی کی روداد بھی ہمیں بڑی تفصیل سے سنائی تھی۔ یہ ایک بڑی دلچسپ اور طویل داستان تھی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ دونوں اپنے ذوق، مزاج، مذہبی اور خاندانی پس منظر ہر لحاظ سے مختلف تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے راستوں کے مختلف ہو جانے ہونے کے باوجود بھی آخر کار انھیں ملا دیا۔

ان دونوں کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ یہ بہت مختلف مزاج کے تھے۔ ایک کا مذہبی پس منظر دیوبندی تھا اور دوسری اہل حدیث پس منظر میں جا چکی تھیں۔ بلال نسبتاً مذہب سے دور تھے جبکہ ماہ رخ بہت زیادہ مذہبی تھیں۔ خیال رہے کہ یہ باطن کا نہیں ظاہر کا ذکر ہے۔ باطنی طور پر تو دونوں گہرے مذہبی ہیں۔ لیکن شادی کے بعد ماہ رخ کے اثر سے بلال زیادہ مذہبی ہو گئے اور ماہ رخ نسبتاً معتدل ہو گئیں۔ بلال نے مجھے یہی بتایا تھا کہ انھوں نے ماہ رخ کا انتخاب کسی مادی بنیاد پر نہیں کیا ان کے دینی ذوق کی بنا پر کیا تھا۔

میرے خیال میں ہمارے معاشرے میں جامد اور ظاہر پرستانہ مذہبیت جس میں ظواہر دین کی پابندی ہوتی ہے اور معقولیت پر مبنی اس دینی ذوق جس میں شریعت پر عمل کم ہوتا ہے، ان دونوں کے بیچ ایسے ہی ایک نکاح کی ضرورت ہے۔ یہ ''نکاح'' ایسے اہل مذہب پیدا کرے گا جو تقلید، انتہا پسندی، بے عملی و بے ذوقی جیسی کمزوریوں سے پاک ہوں گے اور سچی خدا پرستی، اخلاقیات، معقولیت اور عبدیت کا حسین امتزاج ہوں گے۔ یہ لوگ باطنی طور پر خدا سے مضبوط تعلق اور بلند اخلاق رکھنے والے اور ظواہر دین میں اعتدال کی اسی سطح پر کھڑے ہوں گے جو اصل دینی تعلیم میں مطلوب ہے۔ میں جس دین کو قرآن وسنت میں پاتا ہوں وہ ایسا ہی دین ہے۔ اور یہ خوبصورت جوڑا اسی دین اسلام کا عملی اظہار ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ملایا ہے مجھے امید ہے کہ دور جدید میں ایسے ہی کسی ملاپ سے بہت خیر پھوٹے گا۔

تھائی لینڈ کے باشندے

مجھ سے ان دونوں نے دین کے بارے میں بہت سوالات کیے اور میں نے ان سے تھائی لینڈ اور اس کے باشندوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ لوگ چونکہ کئی برس سے یہاں مقیم تھے اس لیے یہاں کے معاملات کو سمجھتے تھے۔ ماہ رخ کو ضرورت کی حد تک تھائی زبان آتی تھی۔ تھائی ہماری زبان کی طرح سیدھی سپاٹ زبان نہیں بلکہ اس میں بولتے وقت آواز اس طرح لہراتے اور گھماتے ہیں کہ لہجے میں ایک مزید ارسی لٹک پیدا ہو جاتی ہے۔ ماہ رخ تھائی کو اسی طرح گھما کر اور لہرا کر بول لیتی تھی۔

انھوں نے تھائی لینڈ کے لوگوں کے بارے میں کئی دلچسپ باتیں بتائیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ یہ تھی کہ شادی کے بعد لڑکا رخصت ہو کر لڑکی کے گھر آتا ہے۔ بلال نے بتایا کہ اس کے پیچھے یہ تصور ہے کہ بیٹیاں ماں باپ کی بہتر خدمت کرسکتی ہیں۔ ویسے یہاں سارے کام خواتین

ہی کو کرتے ہوئے دیکھا۔ سوائے ٹیکسی اور بائیک ٹیکسی کے باقی ہر جگہ ملازمت اور کام میں خواتین ہی کو دیکھا۔ بائیک ٹیکسی یہاں وہ اسکوٹر ہے جس میں ایک آدمی بائیک والے کے پیچھے بیٹھ کر کسی بھی جگہ جا سکتا ہے۔ یہاں چونکہ ٹریفک جام بہت ہوتا ہے اس لیے یہ مختصر فاصلے کے لیے ایک تیز رفتار سواری ثابت ہوتی ہے۔

ان میں لڑکیاں بھی اطمینان سے مرد بائیک ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر سفر کرتی ہیں۔ یہاں مرد و زن کے تعلق کی نوعیت بالکل جدا ہے۔ عفت و عصمت جیسی چیزیں وہ حیثیت نہیں رکھتیں جو ہمارے ہاں ان کا مقام ہے۔ والدین بچوں کو بالکل آزادی دیتے ہیں۔ البتہ عمومی پہلو سے یہ لوگ بہت اچھے اخلاق کے مالک ہوتے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ سلام کرتے ہیں۔ خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔

یہاں رسمی طور پر بادشاہی نظام ہے اور لوگ اپنے بادشاہ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ تاہم اس کے نیچے جمہوری ڈھانچہ کام کرتا ہے۔ مگر آج کل تھائی لینڈ میں مارشل لا لگا ہوا ہے۔ ویسے تو ملک میں کسی قسم کی سنسر شپ نہیں لیکن سیاسی پہلو سے نہ بادشاہ کے خلاف کچھ کہا جا سکتا ہے اور نہ مارشل لا کے خلاف کچھ کہا جا سکتا ہے۔

کرپشن کو ختم کرنے کا طریقہ

یہاں بھی سیاسی حکومت کو فارغ کرنے کی وجہ کرپشن ہی بیان کی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کرپشن اس طرح نہیں رکتی۔ کرپشن بھی زنا کی طرح ہے۔ اس کی خواہش اندر سے پھوٹتی ہے۔ زنا اندر سے رکتا ہے، باہر کے زور و زبردستی سے نہیں۔ باہر سے تو بس قانون سازی کر کے اتنا کیا جا سکتا ہے کہ لوگوں کو علانیہ فحاشی کے ارتکاب سے روکا جائے۔ یہی معاملہ کرپشن کا ہے۔ اس کی اصل انسانی طبیعت میں پائی جانے والی حرص ہے۔ باہر سے قانون سازی اور سزا کا

سلسلہ مقرر کر کے دنیا نے علانیہ کرپشن کا راستہ روکا ہے۔ مگر اس کے نتیجے میں دنیا بھر میں کرپشن کم یا زیادہ عام ہے۔ اس کا اصل علاج اسلام کی وہ سوچ ہے جو مال کو ایک امتحان قرار دیتی ہے۔ ایمان آدمی کو دنیا کے بجائے آخرت کی جنت کی طرف متوجہ رکھتا ہے۔ یہی سوچ کرپشن کو ختم کرتی ہے۔ باقی ہر شکل میں کرپشن کم یا زیادہ جاری رہتی ہے۔

باقی قانون سازی سے کرپشن کو کم کرنے کا راستہ یہ ہے کہ سسٹم کو اتنا سہل و آسان کیا جائے کہ لوگ کبھی کسی قانون کی زد میں نہ آئیں۔ جیسے ہی وہ قانون کی زد میں آئیں گے کرپشن بڑھ جائے گی۔ اسی طرح حکمرانوں کے ہر معاملے کو شفاف اور علانیہ ہونا چاہیے۔ ایک دفعہ جو شخص بھی شہری، صوبائی یا قومی سطح پر منتخب ہو جائے یا سول ملٹری بیوری روکریسی یا عدلیہ سے متعلق ہو جائے، ان سب کے لیے یہ قانونی پابندی ہو کہ وہ تا زندگی ہر سال اپنے اثاثے اور آمدنی کا ریکارڈ حکومت اور عوام کے ملاحظے کے لیے جمع کراتے رہیں۔ جیسے ہی دونوں میں فرق آ جائے، اس شخص پر کیس ہو جانا چاہیے۔ اس طرح کی قانون سازی کے بغیر جو لوگ کرپشن کے خلاف احتساب کی باتیں کرتے ہیں، وہ عوام کو بس احمق بناتے ہیں اور اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں بنایا جاتا ہے۔

عوام کا معیار زندگی

بنکاک میں بلال اور ماہ رخ کا گھر ایک اپارٹمنٹ میں تھا جس کا نام فلیٹ Hasu Haus تھا۔ یہ جاپانی الفاظ ہیں جن کا مطلب House of Lilly ہے۔ اپارٹمنٹ کے وسط میں بنے تالاب کی تہہ میں للّی کے پودے گملوں میں لگے تھے۔ ان پودوں کے جامنی رنگ کے خوبصورت پھول دن میں سطح آب پر آ جاتے ہیں اور رات میں پانی کے اندر چلے جاتے ہیں۔ جبکہ ان کے بڑے بڑے سبز پتے مستقل سطح آب پر تیرتے رہتے ہیں۔

تالاب کے قریب ایک سوئمنگ پول تھا جس میں میرے صاحبزادے دل کھول کر نہائے۔ قریب ہی ورزش کے لیے ایک جم اور دارالمطالعہ بھی تھا۔ اس اپارٹمنٹ کی پچھلی سمت میں ایک خوبصورت نہر بہتی تھی۔ اس نہر کے پیچھے بدھ مت کا ایک خوبصورت ٹیمپل بنا ہوا تھا۔ پیچھے شہر کی بلند و بالا عمارات تھیں۔ یہاں نشستیں پڑی ہوئی تھیں جن پر لوگ بیٹھ کر اس خوبصورت منظر کو انجوائے کر سکتے تھے اور شام اور رات کو وقت مزے سے گزارتے تھے۔ میں نے جب بھی اس منظر کو دیکھا تو میرے سامنے جنات تجری من تحتها الانهار جیسا منظر سامنے آ گیا۔ یہاں اتنا پرسکون اور خوبصورت ماحول تھا کہ گھنٹوں انسان یہاں بیٹھا رہے۔ مگر ہم سیاح تھے، یہاں بیٹھنے نہیں آئے تھے۔

اس اپارٹمنٹ سے بی ٹی ایس کی ٹرین سروس تک کے لیے ایک شٹل ہر آدھ گھنٹے بعد مسلسل چلتی تھی جبکہ بڑی سی رکشہ کی شکل کی ایک سواری ہر وقت گیٹ پر کھڑی رہتی تھی جو یہاں رہنے والوں کو سڑک تک چھوڑ دیتی تھی۔ ان لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ٹک ٹک ہے۔ ہم نے کئی دفعہ یہاں سے ہوٹل اور ہوٹل سے یہاں آتے ہوئے اس میں سفر کیا۔ اس کے علاوہ مین گیٹ پر سیکیوٹی گارڈ بھی تھے۔

میں یہ سب سہولیات دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کوئی طبقہ امرا کے رہنے کی جگہ نہ تھی بلکہ مڈل کلاس لوگوں کے رہنے کی جگہ تھی، مگر جتنی سہولیات اور خوبصورتی یہاں جمع کر دی گئی تھی وہ ہمارے ہاں مہنگے ترین رہائشی علاقوں میں بھی مہیا نہیں کی جاتیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم ترقی یافتہ دنیا ہی سے نہیں بلکہ اس طرح کے ترقی پذیر مما لک سے بھی بہت پیچھے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے انسانوں کی تربیت کے پورے نظام کو تباہ و برباد کر دیا ہے یا اس کی اساسات غلط کر دی ہیں۔ تربیت کا ایک بنیادی اصول یہ ہوتا ہے کہ آپ میں دینے کی نفسیات پائی جائے۔ چاہے

آپ کاروبار کریں۔ چاہے آپ لوگوں سے منافع کمارہے ہوں۔لیکن آپ کے ذہن میں یہ چیز راسخ ہونی چاہیے کہ آپ کو لوگوں کو دینا ہے۔ دینے کی نفسیات جب پیدا ہوتی ہے تو سب لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ایسا نہیں ہوتا کہ تاجروں کا منافع کم ہو جاتا ہے۔ان کا منافع اتنا ہی رہتا ہے، مگر دوسروں کو بھی بہت فائدہ ہوتا ہے۔

دینے میں پانا

مجھے اس حوالے سے ایک ذاتی تجربہ بھی ہے جو میں قارئین سے شئیر کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک داعی ہوں۔اس لیے جو کتابیں لکھتا ہوں ان میں میرے پیش نظر لوگوں تک اپنی بات پہچانا ہوتا ہے۔ کتابوں سے پیسے کمانا کبھی میرے پیش نظر نہیں رہا۔ چنانچہ میری کتابوں پر ہمیشہ کافی ڈسکاؤنٹ دیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ میری تمام کتب میری ویب سائٹ inzaar.org پر بلامعاضہ دستیاب ہیں۔اس پر گرچہ بعض کتب فروش دوستوں نے بہت اعتراض بھی کیا ہے، مگر میں یہی کہتا ہوں کہ ہم داعی ہیں تاجر نہیں ہیں۔

مگر اس کا ایک حیرت انگیز نتیجہ ہم نے دیکھا ہے۔ وہ یہ کہ میری کتابوں کی فروخت فری پی ڈی ایف کی دستیابی کے باوجود کم نہیں ہوتی۔ میں نے سوچا کہ اس کی وجہ کیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ دینے کی نفسیات ہی ہے جو بالواسطہ طور پر کتابوں کی فروخت کا سبب بن رہی ہے۔اصل میں ہوتا یہ ہے کہ فری کتاب ہونے کی وجہ سے لوگ بڑی تعداد میں یہ کتابیں ڈاؤن لوڈ کرتے رہتے ہیں۔ یوں قارئین کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان قارئین میں دس میں سے ایک ضرور ایسا ہوتا ہے جو سمجھتا ہے کہ کتاب پڑھنے کا مزہ اسی وقت ہے جب وہ کتابی شکل میں ہاتھ میں ہو یا پھر وہ کسی شخص کو تحفے میں دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ ایسے سارے لوگ کتاب خرید لیتے ہیں۔ مفت کتاب عام کرنے کی بنا پر قارئین کا جو دائرہ بڑھتا ہے وہ بالواسطہ طور پر کتاب کی فروخت کا سبب

بن جاتا ہے۔ چنانچہ دینے کی نفسیات جو بظاہر نقصان کا سودا ہے اصلاً نقصان کا سودا ثابت نہیں ہوتا۔

ہمیں اپنے معاشرے میں اسی دینے کی نفسیات کو عام کرنا چاہیے۔ ہر شخص دوسرے کو کچھ نہ کچھ دے رہا ہو۔ کچھ نہ سہی تو ایک مسکراہٹ ہی دے دے۔ ایک سلام ہی کسی کو پیش کر دے۔ تاجر اپنی مصنوعات کے ساتھ ڈسکاؤنٹ دے دیں یا پھر کوئی اضافی چیز دے دیں۔ جب سب لوگ یہ کریں گے تو سب کو فائدہ ہوگا اور نقصان کسی کا نہیں ہوگا۔ یہ خدا کی دنیا کا قانون ہے کہ یہاں دینے ہی میں پانا ہوتا ہے۔

مساج سنٹر

ہم جس ہوٹل میں مقیم تھے اس سے باہر نکلتے ہی تین چار مساج سنٹر واقع تھے۔ مساج سنٹر اس پورے خطے کا کلچر ہیں۔ اس کی وجہ بلال نے یہ بتائی کہ اس خطے کی آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ سخت گرمی اور مرطوب موسم کی وجہ سے پسینہ بہت نکلتا ہے اور انسان بہت نڈھال ہو جاتا ہے۔ ایسے میں مساج کرنے سے جسم کی توانائی بحال ہو جاتی ہے۔ چنانچہ صدیوں سے مساج یہاں کے کلچر کا حصہ رہا ہے۔

ٹورازم کے فروغ کے بعد مساج سنٹر کا یہ کلچر اور پھیل گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاحوں کو مساج کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ سیاح پیدل چلتے ہیں اور پیدل چلتے چلتے ان کے پاؤں تھک جاتے ہیں۔ ایسے میں پیروں کا مساج انسان کو بہت سکون دیتا ہے۔

یہاں تک تو کوئی خرابی نہیں ہے، مگر بدقسمتی سے مساج کے ساتھ یہاں ایک دوسری چیز شامل ہو چکی ہے۔ وہ یہ کہ یہاں بیشتر کام خواتین ہی کرتی ہیں، چنانچہ مساج سنٹر میں یہ خدمت زیادہ تر خواتین سرانجام دیتی ہیں۔ یہیں سے بدکاری کی راہ بہت آسانی سے کھلتی ہے۔ جس کے

نتیجے میں مساج اور بدکاری کچھ ساتھ ساتھ ہی سمجھے جانے لگے ہیں۔ جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

مساج یہاں کے لوگوں اور سیاحوں دونوں کی ایک ضرورت ہے۔ چنانچہ میرے ہوٹل کے باہر جو مساج سنٹر تھے وہاں زیادہ تر مقامی لوگ ہی ہوتے تھے جو کام سے واپس آتے ہوئے اپنی تکان اتارنے کے لیے مساج کراتے تھے۔ البتہ دوسرے والے مساج سنٹرا لگ سے ہی پتا چل جاتے ہیں۔ وہاں موجود خواتین کی سج دھج، لباس اور ناز و انداز بتادیتا ہے کہ ان کے ارادے کیا ہیں۔ بلکہ وہ آگے بڑھ کر لوگوں کو خدمات پیش کردیتی ہیں۔ پھوکٹ میں مجھے اس کا تجربہ اس وقت ہوا جب میں پانچ منٹ کے لیے اپنی اہلیہ سے الگ ہوا۔ وہ شاپنگ سنٹر کے اندر تھیں اور میں اس شغل سے بیزار ہوکر سڑک پر ٹہلنے نکلا تو ایک مساج سنٹر راستے میں پڑا۔ باہر بیٹھی خواتین نے فوراً پیش قدمی کر کے اندر آنے کی دعوت دی۔ ان کا لباس اور حلیہ اس بات کا اعلان عام تھا کہ مساج کے علاوہ بھی دیگر ''سہولیات'' میسر ہیں۔ میں الٹے قدموں واپس مڑ گیا۔

ایسی جگہوں پر بیوی کا ساتھ ہونا ہمیشہ ایک ریڈ سائن ہوتا ہے جو دیگر خواتین کو آپ سے دور رکھتا ہے۔ ورنہ جیسے ہی آپ تنہا ہوتے ہیں آپ فوراً نشانہ بن جاتے ہیں۔ یہ بات وسیع تر مفہوم میں پوری زندگی کے لیے ٹھیک ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم اپنے نوجوانوں کی شادیوں میں تاخیر کو کلچر بنا چکے ہیں۔ تیرہ چودہ برس کی عمر میں بالغ ہونے والے نوجوان کی شادی ہم تیس سال تک موخر کیے رکھتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے نوجوانوں کو خود شیطان کی خدمت میں پیش کردیتے ہیں۔

خیر ذکر ہو رہا تھا مساج سنٹر کا جو میرے ہوٹل سے باہر واقع تھے۔ میں پچھلے سفر کی طرح اس دفعہ بھی چاہنے کے باوجود پیروں کا مساج نہیں کرواسکا۔ حالانکہ اپنے شہر میں تیل کی بوتلوں کو

باہمی ٹکرا کر ٹناٹن آواز نکالتے مالشیوں سے کئی دفعہ مالش کرائی ہے۔اور بلاشبہ یہ تکان اتارنے کا بہت موثر ذریعہ ہوتا ہے کیونکہ خون تیزی سے جسم کے ان حصوں میں پہنچ کر اعصاب کو پرسکون کر دیتا ہے۔مگر یہاں کے مساج سنٹر میں ایک تو خواتین کی موجودگی مانع رہی اور ایک جگہ جہاں مرد تھے وہاں بھی طبعیت آمادہ نہیں ہوئی۔شاید لاشعور میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ ان مساج سنٹر سے بدکاری کا راستہ کھلتا ہے۔

بنکاک میں دعوتی مصروفیات

ماہ رخ کے متعلق پیچھے بیان ہو چکا ہے کہ اس کا بہت اچھا دینی ذوق ہے۔اس نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں پاکستانی کمیونٹی کی خواتین میں درس قرآن بھی دیتی ہے۔ بلال نے پاکستانی کمیونٹی تک اپنی رسائی کا جو واقعہ سنایا وہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ یہ دونوں جب یہاں نئے نئے آئے تو سمجھتے تھے کہ یہاں کوئی پاکستانی نہیں ہے۔ایک روز اتفاق سے انھیں شاپنگ سنٹر میں ایک بزرگ مل گئے۔ان دونوں کو اردو بولتے ہوئے سنا تو ان سے مسجد کا معلوم کیا۔گفتگو ہوئی تو شناسائی کی اور شکلیں بھی سامنے آ گئیں۔اور پھر ان بزرگ نے پاکستانی سفارتخانے کی عید ملن تقریب میں مدعو کرلیا جس میں سفیر پاکستان نے تھائی لینڈ میں مقیم پاکستانیوں کو مدعو کیا تھا۔

اس طرح کی تقریبات میں عموماً کمیونٹی کے زیادہ اثر و رسوخ والے اور دولتمند افراد ہی شریک ہوتے ہیں۔مگر اس ذریعے سے اللہ نے انھیں وہاں پہنچا دیا۔وہاں ماہ رخ نے دو بزرگ خواتین کو کچھ الگ تھلگ دیکھا تو ان کو کمپنی دینے پہنچ گئی۔ باتوں باتوں میں ان خواتین کو پتہ چلا کہ ماہ رخ نے باقاعدہ قرآن پڑھا ہوا ہے تو اس سے قرآن پڑھانے کا کہا۔ جس کے بعد ماہ رخ کا ہفتہ وار خواتین کا درس قرآن کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس نیکی سے اللہ نے اپنی کتاب کی

خدمت کا ایک کام لینا شروع کر دیا۔

ان دو بزرگ خواتین میں سے ایک مبارکہ آپا تھیں جن کے گھر میں ماہ رخ نے میرے پروگرام کا اہتمام کیا تھا۔ مبارکہ آپا بہت نیک طبع خاتون تھیں جن کے شوہر کئی دہائیوں سے تھائی لینڈ میں مقیم تھے اور ان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بڑا بزنس تھا۔ اب ان کی طبیعت کافی ناساز تھی اور ان کے بچے کاروبار سنبھالے ہوئے تھے۔

ہم بلال اور ماہ رخ کے ساتھ مبارکہ آپا کے ہاں پہنچے۔ آج پروگرام میں خواتین اپنے شوہروں کے ہمراہ آئی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک فرویٰ اور حسن تھے۔ ایک دن قبل ہی ہم ان دونوں میاں بیوی کی میزبانی کا مزہ لے چکے تھے۔ ایک بڑے شاپنگ سنٹر میں ان کا فاسٹ فوڈ کا اسٹال تھا۔ ہم شاپنگ سنٹر گھومتے گھماتے وہاں پہنچے تو کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ میرے شدید اصرار کے باوجود ہم نے کھانے پینے کی جو چیزیں لیں، انھوں نے اس کے پیسے نہیں لیے تھے۔ ان کی محبت تھی کہ آج یہ دونوں اپنا اسٹال بند کر کے خاص طور پر درس میں شریک ہونے آئے تھے۔

حسن اعلیٰ تعلیم یافتہ یعنی ایم بی اے تھے۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے کاروبار کا راستہ اختیار کیا۔ یہ ایک بہت احسن رویہ ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر تعلیم یافتہ لوگ کاروبار کی طرف نہیں آتے۔ انسان میں اگر حوصلہ ہے تو اسے کاروبار ضرور کرنا چاہیے۔ کاروبار ترقی کا راستہ ہے۔ مگر ہمارے ہاں لوگ سمجھتے ہیں کاروبار صرف وہی ہوتا ہے جو بہت بڑی سرمایہ کاری کے ساتھ ہو۔ جبکہ کاروبار کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ایک دفعہ کاروبار میں انسان سیٹ ہو جائے تو بتدریج اس کا دائرہ پھیلایا جاسکتا ہے اور خود انسان کو نفع ہونے کے ساتھ دوسروں کو بھی ملازمت فراہم کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

فرویٰ اور حسن کے علاوہ وہاں اور بھی مزید فیملیز تھیں۔ یہ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے پوزیشن پر کام کرنے والے لوگ تھے۔ ان کا دینی ذوق اور دین کی بات سننے کے لیے ان کا آنا ایک بہت خوشگوار تجربہ تھا۔ میرے پاس اب کہنے کے لیے ایمان و اخلاق کے سوا کچھ بھی نہیں اور نہ اس کے سوا میں نے وہاں کچھ کہا۔ یہی وہ دعوت ہے جس میں آخرت کی فلاح پوشیدہ ہے اور یہی وہ دعوت ہے جس میں دنیا کی فلاح بھی پوشیدہ ہے۔ درس کے بعد سوالات بھی ہوئے۔ ان سے بھی لوگوں کے دینی ذوق کا اندازہ ہوا۔

دوسرا پروگرام اس وقت ہوا جب میں بنکاک سے واپس آیا۔ ماہ رخ نے درخواست کی تھی کہ مجھ پر گراں نہ ہو تو اس کا ہفتہ وار درس کا پروگرام میں لے لوں۔ میرے لیے تو یہ دعوت پہنچانے کا ایک موقع تھا اس لیے حامی بھر لی۔ یہ پروگرام حنا تمکین صاحبہ کے گھر ہوا۔ اس پروگرام میں صرف خواتین شریک تھیں۔ کیونکہ یہ اصلاً ماہ رخ کی درس قرآن کی کلاس تھی۔ اس پروگرام میں زیادہ تر خواتین کا کردار اور بچوں کی تربیت کے پہلو زیر بحث رہے۔

دورِ جدید میں خواتین کا کردار

خواتین سے جب کبھی گفتگو کا موقع ملتا ہے میں انھیں اس طرف ضرور توجہ دلاتا ہوں کہ معلوم انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ خواتین کے لیے معاشرے میں ایک انتہائی موثر کردار ادا کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ ورنہ اس سے قبل انسانی معاشرے اصلاً مردوں کے معاشرے ہی رہے ہیں۔ مگر پہلے صنعتی اور اب انفارمیشن ایج اور اس کے بعد آنے والے آٹومیشن ایج میں خواتین کے لیے مقدر ہے کہ وہ معاشرے کی تعمیر میں کہیں زیادہ موثر کردار ادا کریں۔

مغرب میں تو عرصہ ہوا خواتین معاشرتی زندگی میں فعال ہو چکی ہیں۔ مگر وہاں وہ زیادہ تر خاندان میں اپنا کردار کم کر کے باہر ایک کارکن کی حیثیت میں کام کر رہی ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں

خواتین ابھی تک پوری طرح خاندان سے وابستہ ہیں۔ اس پس منظر میں ہماری خواتین اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے ایک ماں کی جگہ پر کھڑی ہوتی ہیں۔ چاہے ان کی شادی ہو یا نہ ہو یا ان کی اولاد ہو یا نہ ہو۔ ماں کا مزاج ہوتا ہے کہ وہ بچے کی پوری ذمہ داری اٹھاتی ہے اور اس کو جوانی کے کمال تک پہنچا کر دم لیتی ہے۔ یہ اونرشپ اور ذمہ داری لینے کا مزاج ہر اس کام میں آجاتا ہے جس میں ہماری خواتین ہاتھ ڈالتی ہیں۔

بدقسمتی سے اس خوبی کے ساتھ ہماری خواتین میں اپنے پس منظر کی بنا پر کچھ کمزوریاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ ایک بناؤ سنگھار اور شاپنگ کا حد سے بڑھا ہوا شوق، دوسرا دیگر لوگوں سے موازنہ اور مقابلہ اور تیسرا غیر ضروری کاموں جیسے ٹی وی دیکھنے یا فضول باتیں کرنے میں وقت ضائع کرنا۔ ہماری خواتین اگر ان تین بنیادی کمزوریوں پر قابو پالیں تو وہ معجزے کر سکتی ہیں۔

بنکاک کے شاپنگ سنٹرز

تھائی لینڈ میں گھومنے پھرنے کی جگہیں بنکاک سے باہر ہیں۔ بنکاک کی وجہ شہرت شاپنگ ہی ہے۔ اس مقصد کے لیے یہاں بڑے بڑے شاپنگ سنٹر بنے ہوئے ہیں۔ یہ بلاشبہ بہت خوبصورت بنے ہوئے ہیں، مگر میں بیس پچیس سال میں مختلف ملکوں کے اتنے شاپنگ سنٹر دیکھ چکا ہوں کہ اب ان میں کوئی کشش باقی نہیں رہی ہے۔

مگر بنکاک میں اپنی اہلیہ کی وجہ سے ہم تین دن کے قیام میں زیادہ تک شاپنگ سنٹر ہی گئے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو سامان یہاں ملتا ہے وہ بہت معیاری اور خالص ہوتا ہے۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ اہل پاکستان کو ان دو چیزوں کو مطلب سمجھایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ ہمارے تاجران دونوں تصورات سے واقف نہیں ہیں۔

بنکاک میں ہم سیام اور ایم بی کے جیسے بڑے اور مشہور شاپنگ سنٹر بھی گئے۔ ہوٹل سے

قریب ٹیسکو شاپنگ سنٹر کی مشہور چین کا ایک بڑا شاپنگ سنٹر موجود تھا۔ یہاں حلال کھانے جیسے حلال کے ایف سی وغیرہ دستیاب تھے۔ اس لیے کئی دفعہ یہیں کھانا کھایا۔ ایک موقع پر بلال اور ماہ رخ نے ٹیسکو کے ایک تھائی ریسٹورنٹ میں تھائی کھانا بھی کھلایا۔ تھائی کھانوں بلکہ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کے تمام علاقوں کے کھانوں میں یہ مسئلہ ہے کہ وہاں کھانے میں ایک خاص بو آتی ہے۔ یہ غالباً کسی مصالحے کی بو ہے۔ مگر ہمارے لیے یہ اتنی ناپسندیدہ ہے کہ اس کے ساتھ کھانا کھانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ شکر ہے کہ انھوں نے جو کھانا منگایا اس میں سے کم از کم ایک میں سے یہ بو نہیں آ رہی تھی۔

ایک اور شاپنگ سنٹر بھی ٹیسکو کے سامنے تھا۔ یہاں زیادہ تر بڑی بڑی برانڈز کے آؤٹ لیٹ تھے۔ خواتین وہاں گئیں تو بلال صاحبزادے کو مختلف گیم کھلانے کے لیے بچوں کے پلے ایریا میں لے گئے۔ یہاں ایک مساجر چیئر بھی موجود تھی جس پر انھوں نے مجھے بٹھا دیا۔ میں اس سے قبل پاکستان میں کراچی ڈریم ورلڈ میں کئی دفعہ اس کا تجربہ کر چکا ہوں۔ یہ کرسی اس طرح پورے جسم کا مساج کرتی ہے کہ انسان ذہنی اور جسمانی طور پر فریش ہو جاتا ہے۔

میں اس طرح کی چیزیں دیکھ کر سوچتا ہوں کہ انسان اپنے عجز کے ساتھ اس طرح کی چیزیں بنا سکتا ہے تو خدا نے جنت میں انسان کے سکون و راحت کے کیا کیا اہتمام کیے ہوں گے۔ ایک غافل انسان کے لیے یہ دنیا اور اس کی نعمتیں حاصل زندگی ہوتی ہیں، مگر قرآن کا ذوق رکھنے والے کے لیے یہ آنے والی جنت کا ایک زندہ تعارف بن جاتی ہیں۔

بنکاک کی بلند ترین عمارت کی سیر

اس آنے والی جنت کے حوالے سے قرآن میں بیان ہوا ہے کہ وہاں اہل جنت کے رہنے کے لیے بلند و بالا مقامات ہوں گے۔ بلندی پر رہنا انسان کو ہمیشہ سے پسند ہے۔ کیونکہ بلندی

سے دور دور تک کا منظر نظر آتا ہے۔ انسان خود کو فطرت سے زیادہ قریب محسوس کرتا ہے۔ مجھے بلند مقامات پر جانے کا ہمیشہ سے شوق ہے۔ بہت عرصہ پہلے کسی رسالے میں بینکاک کی ایک بلند عمارت کی چھت کی تصویر دیکھی تھی جہاں سے پورے شہر کا منظر بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ 2008 میں بنکاک آیا تو اس بلڈنگ کو بہت تلاش کیا کیونکہ نام معلوم نہ تھا۔ آخری دن میں معلوم ہوا تھا کہ یہ Baiyoke Tower نامی ایک ہوٹل ہے جہاں جانے کی شکل صرف یہ ہے کہ کھانے کے لیے جایا جائے اور یہ کھانا حلال نہیں ہوگا۔

خیر اس دفعہ یہ ماجرا بلال سے بیان کیا تو معلوم ہوا کہ بلال اور ماہ رخ نے پہلے ہی یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ ہمیں بنکاک کی نئی بننے والی سب سے بلند عمارت پر لے کر جائیں گے۔ یہ MahaNakhon نامی بلڈنگ تھی جو 2016 میں مکمل ہوئی اور اس نے Baiyoke Tower کو پیچھے چھوڑ دیا جو اس سے قبل تھائی لینڈ کی سب سے بلند عمارت بلکہ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کا سب سے بلند ہوٹل ہے۔

یہ 78 منزلہ اور 314 میٹر بلند عمارت ہوٹل کے علاوہ تجارتی اور رہائشی مقصد کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس کی دلچسپ بات اس کا وہ طرز تعمیر ہے جس میں دیکھنے والے کو یہ لگتا ہے کہ شیشے سے بنے ایک چوکور ہموار ستون پر ایک کھردری پٹی لپٹی ہوئی اوپر بڑھ رہی ہے۔ یہ کھردری پٹی دراصل شیشے کے باکس کی شکل میں بنی وہ بالکونیاں ہیں جو آگے نکلی ہوئی ہیں اور ان میں کھڑے ہو کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ گویا فضا میں معلق کھڑے ہو کر سامنے، دائیں اور بائیں سے شہر کا منظر دیکھ رہے ہیں۔ یہ بالکونیاں اگر ہر فلور پر ہوں تو دوسری بالکونی کے لیے رکاوٹ بن جائیں گی۔ اس لیے یہ کسی فلور پر تھیں اور کسی پر نہیں، کسی کی بالکونی بہت زیادہ آگے نکلی تھی اور کسی کی کم۔ اسی سے دور سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ایک کھردری پٹی بلڈنگ پر لپٹی اوپر کی

سمت بڑھ رہی ہے۔اس طرح کے گھروں کی قیمت بھی کروڑوں ڈالرہی میں ہے۔

تاہم عام لوگوں کے لیےاس عمارت کی چھت ایک زیادہ دلچسپ منظر پیش کرتی تھی۔ بلال اور ماہ رخ ہمیں وہیں لے کر گئے۔داخلے کا ٹکٹ لے کر بلال اور ماہ رخ ہمیں لفٹ کی طرف لے کر چلے۔جس راہداری سے ہم گزر رہے تھے،اس کی چھت پر پورے شہر کی عمارات کا نقشہ سفید رنگ سے بنی پلاسٹ کی عمارات کی شکل میں ابھرا ہوا تھا۔گویا کہ چھت پر پورا شہر الٹا لٹکا ہوا اوران میں سب سے بلند عمارت مہانکون کی یہی عمارت تھی جس میں ہم کھڑے تھے اوراسے ایک دوسرے رنگ سے ممتاز کر کے دکھایا گیا تھا۔

اس کی لفٹ بھی بہت تیز رفتار تھی ۔ ماہ رخ نے لفٹ میں بیٹھے ہوئے بتایا کہ یہ ہمیں چوہترویں فلور پر صرف 50 سیکنڈ میں پہنچادے گی۔ماہ رخ نے لفٹ کے چلنے پر کسی غیر متوقع چیز کے لیے تیار رہنے کا بھی کہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ لفٹ سے باہر کا منظر نظر آئے گا،مگر لفٹ چلی تو لفٹ کی دیواریں اسکرین بن گئیں۔اسکرین پر بنکاک کے مشہور دریا چھاؤ پھریا کا منظر آیا اورایسے لگا کہ گویا ہم اس دریا پر کسی بوٹ میں بیٹھے سفر کررہے ہیں۔

پس منظر میں بوٹ کے چلنے کی آواز بھی آنے لگی۔پھر سکرین پر منظر بدلا اورہمیں لگا کہ ہم ہوا میں پرواز کررہے ہیں اوراڑتے ہوئے شہر کی عمارات اورسڑکوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے فضا میں اس طرح بلند ہوگئے ہیں کہ پورے شہر کا منظر ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ہمیں لگا کہ ہم آسمانوں میں اڑرہے ہیں۔مگر پچاس سیکنڈ میں یہ منظر ختم ہوگیا اورہم تین سو میٹر اوپر پہنچ گئے اور لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔

دنیا کا دھوکا

یہ ایک بڑا غیر معمولی تجربہ تھا۔دورجدید میں اس طرح کی دسیوں چیزیں دنیا کے بڑے

بڑے تھیم پارکس میں موجود ہیں جن میں بدلتے مناظر، آوازوں اور حرکت کے ذریعے سے حواس کو اس طرح متاثر کیا جاتا ہے اور ایسا تاثر پیدا کر دیا جاتا ہے کہ انسان حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ وہ کہاں موجود ہے اور وہی سمجھنے لگتا ہے جو دکھانے والے اسے دکھانا چاہتے ہیں۔ جیسے پچاس سیکنڈ کے تیز رفتار لفٹ کے اس سفر میں ہمیں لگا کہ ہم دریا سے اڑے اور پھر کسی اڑن قالین پر بیٹھے عمارتوں کے بیچ تیرتے ہوئے آسمانوں میں بلند ہو گئے۔

میں کبھی سوچتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی مادی دنیا کچھ اسی طرح بنائی ہے۔ انسان اس دنیا کے دھوکے میں مبتلا ہو کر اسی کو حقیقت سمجھنے لگتا ہے۔ انسان اس جادونگری کی رونقوں اور اس کے رنگوں میں ایسا گم ہوتا ہے کہ اسے حقائق بھول جاتے ہیں۔ انبیا آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ دنیا ایک دھوکا ہے۔ یہ ہوش سنبھالنے کے بعد بمشکل پچاس سال کا ایک سفر ہے جو اس لفٹ کے پچاس سیکنڈ کی طرح تیزی سے گزر جائے گا۔

پھر برزخ کا دروازہ کھلے گا اور معلوم ہوگا کہ پچھلی دنیا تو ایک فریب کے سوا کچھ نہ تھی۔ وہ ایک دھوکا تھا جس میں انسانوں کا امتحان ہو رہا تھا۔ یہ دیکھا جا رہا تھا کہ کون اس دھوکے میں آکر اسی دنیا کو ابدی حقیقت سمجھتا ہے اور خود کو اپنے تعصّبات اور خواہشات کے حوالے کر دیتا ہے اور کون ہے جو آخرت کی ابدی، حقیقی اور ختم نہ ہونے والی دنیا کا طلبگار بنتا ہے۔ کون ہے جو اپنی باگ نفس، شیطان، فرقہ اور تعصب کے حوالے کرتا ہے اور کون ہے جو ان زنجیروں کو توڑ کر خود سچا خدا پرست ثابت کرتا ہے۔

اس لفٹ نے مجھے پچاس سیکنڈ میں باشعور زندگی کے اسی پچاس سالہ دھوکے کا تجربہ کرا دیا۔

الٹے انسان اور خدا کی عظمت

ہم لفٹ سے نکلے تو باہر شیشے سے بنی ہوئی مشاہدہ گاہ تھی جس میں چاروں طرف گھوم کر شہر

کے ہر حصے کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ مگر ان شیشوں کے بیچ میں جگہ جگہ وہ ستون تھے جن میں یہ شیشے فکس تھے اس لیے شہر کے ایک طائرانہ جائزے کے لیے یہ جگہ موزوں نہ تھی۔ البتہ اس کی ایک دلچسپ چیز یہ تھی کہ چھت پر شیشہ تھا اور چھت دیکھنے سے ہر شخص الٹا لٹکا ہوا نظر آتا تھا۔

انسانوں کو چھت پر الٹا لٹکا دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس کرہ ارض پر دراصل انسان الٹے ہی لٹکے ہوئے ہیں۔ یہ زمین ایک گیند کی طرح گول ہے۔ یہ گیند خلا میں معلق ہے۔ جو لوگ پاکستان میں وہ مخالف سمت یعنی امریکہ میں موجود لوگوں کے لیے الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ اور وہاں موجود لوگ ہمارے لحاظ سے زمین پر الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ یہ خدا کی عجیب وغریب قدرت ہے کہ اس نے زمین میں قوت کشش رکھ دی ہے جس کی وجہ سے سب لوگ زمین سے چپکے رہتے ہیں ورنہ سب لوگ زمین سے اڑ کر خلا میں منتشر ہو جاتے۔ ہمارے رب نے ہماری زندگی برقرار رکھنے کے کتنے حیرت انگیز انتظامات کر رکھے ہیں، مگر اس کے باوجود ہماری زبانیں اس کی عظمت وکبریائی اور نعمت واحسان کو بیان کرنے سے محروم ہیں۔

گلاس فلور

ہم کچھ دیر یہاں رکنے کے بعد اوپر ٹاپ فلور پر لے جانے والی لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔ اس لفٹ میں بیٹھ کر ہم دو فلور اوپر گئے جہاں پر اوپر چھت کھلی ہوئی تھی اور اس کھلی چھت سے پورے شہر کا نظارہ ممکن تھا۔ مگر اس سے پہلے یہاں زیادہ دلچسپ چیز گلاس فلور تھی۔ میں سن 2001 میں کینیڈا میں تھا تو وہاں سی این ٹاور میں جو کہ اس وقت تک دنیا کا سب سے بلند ٹاور تھا، گلاس فلور کا تجربہ کیا تھا۔ مگر اس عمارت کا گلاس فلور بہت زیادہ شفاف اور بڑا تھا اور یہاں اوپن ائیر اور چاروں طرف کے شیشوں سے بہت جدا تاثر پیدا ہو گیا تھا۔ اس گلاس فلور پر ایک خاص قسم کے چمڑے کے جوتے پہن کر جانا ضروری تھا تاکہ شیشے کے فرش پر نشان نہ آجائے۔

اس گلاس فلور پر جانے کے بعد ایک عجیب سا تجربہ ہوتا ہے۔ ایک تو چاروں طرف سے اس گلاس پر کھڑے ہو کر شہر کا منظر نظر آ رہا تھا اور اس سے کہیں زیادہ سنسنی خیز یہ منظر تھا کہ جس فرش پر ہم کھڑے تھے اس سے نیچے شہر کا منظر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت مضبوط شیشہ تھا جس کے ٹوٹنے کا امکان نہ تھا، مگر ہمارا ذہن اس بات کو قبول نہیں کرتا۔ اس لیے اس شیشے پر کھڑے ہو کر ہر دم یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ یہ شیشہ اب ٹوٹا کہ تب ٹوٹا۔ ہم تھوڑی دیر اس پر رک کر واپس آ گئے لیکن اتنے اوپر سے اپنے پیروں تلے شہر کو دیکھنا ایک بہت منفرد تجربہ تھا۔

PDA(Public Display of Affection)

گلاس فلور سے فارغ ہو کر ہم نے چھت کا بغور جائزہ لیا تو دیکھا کہ کچھ سیڑھیاں چڑھ کر اس بلڈنگ کا سب سے آخری فلور ایک کھلی چھت کی شکل میں بنا ہے جس کے چاروں طرف ریلنگ لگی ہوئی ہے۔ یہ گویا کہ سب سے زیادہ بلند جگہ سے شہر کو دیکھنے کی جگہ تھی۔ تاہم وہاں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی اور ہم سکون سے بیٹھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے سارے لوگ اوپر جانے والی ان سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی عمارت کی تنگ سیڑھیوں کی طرح نہیں تھیں جو کسی دروازے پر کھلتی تھیں بلکہ اتنی ہی لمبی تھیں جتنی چھت کی لمبائی تھیں۔ ہم بھی وہیں جا کر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے نیچے گلاس فلور تھا جس پر لوگ کھڑے ہو کر مختلف بلکہ عجیب وغریب پوز میں تصویریں بنوا رہے تھے۔ بلال نے بتایا کہ یہ چائنیز نسل کے لوگ سادہ انداز میں تصاویر نہیں بنواتے بلکہ ایسے ہی عجیب وغریب طریقوں سے پوز بنا کر تصاویر بنواتے ہیں۔

تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر ہم اوپر چلے گئے اور وہاں جا کر تصاویر اتارنے لگے۔ اس موقع پر میں نے بلال سے کہا کہ تم ماہ رخ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تصویر بنوالو۔ ہمارا پی ڈی اے بس اتنا ہی ہوتا ہے۔ میری اس بات کا پس منظر بلال کا ایک سوال تھا جو انھوں نے ایک دو دن قبل مجھ سے کیا تھا۔ ان کا سوال تھا کہ اسلام میں PDA(Public Display of Affection)

کی کیا حیثیت ہے جب وہ ایک میاں بیوی کے بیچ میں ہو۔ PDA کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک مرد وعورت لوگوں کے درمیان کھڑے ہوکر جسمانی اتصال سے اظہار محبت کریں۔ اس میں بوس وکنار سے لے کر لپٹنا اور چمٹنا سب شامل ہیں۔

میاں بیوی اگر تنہائی میں اپنے گھر میں ہوں تو ظاہر ہے کہ کسی قسم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے معاشروں میں بھی عام طور پر پی ڈے اے کا رواج نہیں، اس لیے یہ سوال وہاں بھی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر باہر ممالک میں رہنے والے مسلمان جوڑوں میں اکثر یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے۔ خاص کر ان بچوں کے لیے جو انھی معاشروں میں بڑے ہوئے ہوں جہاں اس طرح کی چیزیں معیوب نہیں سمجھی جاتیں۔

دین نے ظاہر ہے کہ براہ راست اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس لیے میں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنا نقطہ نظر ان کے سامنے رکھ دیا تھا کہ جس چیز میں جنسیت شامل ہو، لوگوں کے درمیان اس کا اظہار چاہے وہ میاں بیوی کے درمیان بھی ہو، تب بھی میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ بلال کا کہنا تھا کہ اگر کوئی عمل غیر جنسی ہو جیسے پیشانی پر بوسہ تو کیا وہ بھی غلط ہے۔ میں نے اس سے بھی باوجوہ احتراز کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ تاہم اِس موقع پر کندھے پر ہاتھ رکھنے کے حوالے سے انھیں اپنا نقطہ نظر بتا دیا تھا کہ کسی خاص موقع پر یہ کیا جاسکتا ہے۔

تاہم یہ بات میں پھر دہرادوں کہ اس طرح کی چیزوں کو شریعت نے اپنا موضوع نہیں بنایا ہے۔ چنانچہ ہمارے جیسے ادنیٰ طالب علم یا دیگر اہل علم جب رائے قائم کرتے ہیں تو دین کا مجموعی مزاج پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی معاشرے کے عرف وعادت کو اس میں بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔

اس عرف وعادت کی ایک مثال خود ہمارا اپنا معاشرہ ہے۔ پچھلی صدی میں ہماری معاشرتی اقدار بہت مختلف تھیں۔ ہماری والدہ بتاتی ہیں کہ جب ہماری سب سے بڑی بہن (جو خود اب نانی اور دادی بن چکی ہیں) پیدا ہوئیں تو والد مرحوم بیٹی کو دیکھنے کے شوق میں اُس کمرے میں

آ گئے جہاں والدہ تھیں۔ ہماری دادی مرحومہ نے جو اُنھیں اندر آتے دیکھا تو بے شرم بے حیا کہہ کر ایسی بے نقط سنائیں کہ حد نہیں۔ والد صاحب الٹے پاؤں کمرے سے بھاگے اور پھر چالیس دن بعد کہیں جا کر پہلی دفعہ اپنی بیوی (یعنی ہماری والدہ) اور بیٹی کو دیکھا۔ یہ اُس زمانے کا رواج تھا۔ اب ظاہر ہے کہ اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔

چنانچہ اس خاکسار کا نقطہ نظر یہ ہے کہ میاں بیوی کا جسمانی لمس اگر جنسی نوعیت کا ہے تو لوگوں کے سامنے اس کی گنجائش دین کی روشنی میں نہیں ہے۔ اگر غیر جنسی ہے تو پھر عرف و عادت اس کا فیصلہ کرے گا۔ کوئی حتمی چیز اس حوالے سے نہیں کہی جا سکتی۔

بنکاک کا نظارہ

ہم سیڑھیاں چڑھ کر جس جگہ آ گئے تو وہ بلڈنگ کا بلند ترین مقام تھا۔ یہ ایک کھلی چھت تھی جس کے تین طرف ریلنگ لگی تھیں اور ایک سمت سیڑھیاں تھیں جن سے چڑھ کر لوگ اوپر آ رہے تھے۔ یہی وہ سمت تھی جہاں نیچے گلاس فلور تھا۔ چنانچہ لوگ ان سیڑھیوں پر بیٹھ کر گلاس فلور پر جانے والوں کو خوشی، حیرت اور اہتزاز (Thirll) کا اظہار کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

یہاں چاروں طرف سے بنکاک کا ایک انتہائی خوبصورت اور غیر معمولی نظارہ سامنے تھا۔ دور دور تک پھیلا ہوا یہ شہر بنکاک جس کی آبادی 80 لاکھ سے زیادہ ہے، اس وقت ہمارے سامنے تھا۔ چھاؤ پھریا دریا شہر کی مشرقی سمت سے نمودار ہو رہا تھا اور بل کھا کر جنوب کی سمت مڑ رہا تھا۔ یہی وہ جنوبی حصہ تھا جس رخ پر گلاس فلور بنا تھا۔ دریا جنوب میں سیدھا جاتے جاتے اچانک نوے ڈگری کے زاویے پر مڑ کر مغربی سمت سے گزرتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ اس طرح گویا کہ بلڈنگ کے تین سمت دریا کا منظر تھا۔ اس بہتے اور بل کھاتے دریا نے منظر کو بہت خوبصورت بنا رکھا تھا۔ جبکہ چوتھی سمت یعنی شمال میں سب سے نمایاں نظر آنے والی عمارت baiyoke Sky ہوٹل کی بلڈنگ تھی جو مہانکون سے قبل بنکاک کی سب سے بلند عمارت تھی۔ اس کے علاوہ بھی شہر میں ہر سمت اونچی نیچی عمارات نظر آ رہی تھیں۔ کچھ عمارتیں کافی بلند تھیں

اور اپنے قد و قامت سے اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلا رہی تھیں، مگر یہ صاف دیکھا جا سکتا تھا کہ مہانکون کی عظمت کے سامنے وہ دست بدستہ کھڑے ہونے پر مجبور ہیں۔ مغربی سمت اس منظر کا سب سے خوبصورت منظر پیش کر رہی تھی۔ اس لیے کہ اس سمت آسمان پر سورج ڈھل رہا تھا۔ پیش منظر میں شہر کی عمارات اور خاص کر چھاؤ پھریا دریا کے بہتے پانی نے خوبصورتی کا بھرپور تاثر پیدا کر دیا تھا۔

میں اس سے قبل بہت سی بلند عمارات پر جا چکا ہوں۔ مگر ان میں سے بیشتر میں شہر کا نظارہ شیشے سے بنی مشاہدہ گاہ ہی سے کرایا جاتا ہے۔ مگر یہاں ہم کھلی فضا میں کھڑے تھے۔ ہوا نہ ٹھنڈی تھی نہ گرم تھی اور نہ اتنی تیز تھی کہ کھڑے رہنا مشکل ہو۔ چنانچہ کھلی فضا میں شہر کا منظر دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔

مسلمان اور غیر مسلم

ہم یہاں جان بوجھ کر سہ پہر کے وقت آئے تھے کہ دن کی روشنی، شام اور رات کا منظر دیکھ سکیں۔ بلاشبہ ہر منظر بہت خوبصورت اور دلکش تھا۔ سہ پہر کی روشنی میں پورے شہر کا نظارہ ممکن تھا۔ شام میں ڈوبتے سورج کی روشنی میں شہر نے گویا پیلی روشنی سے بنا زرد لباس اوڑھ لیا تھا اور رات کی تاریکی چھائی تو بنکاک کا شہر روشنیوں کے شہر میں تبدیل ہو گیا۔

ہمارے ساتھ مختلف ملکوں اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے سیاح یہاں موجود تھے۔ مگر تہذیب ایک ہی نظر آتی تھی۔ وہ مغربی تہذیب تھی۔ ساری خواتین مغربی لباس میں تھیں۔ مغربی موسیقی بج رہی تھی اور انتظامیہ کی طرف سے مقرر ایک لڑکی وائلن بجا کر اس میں اپنا حصہ ڈال رہی تھی۔ نیچے ایک بار تھا اور ہر جگہ لوگ موسیقی کی دھن پر شراب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

دنیا کی جنت اپنے جوبن پر نظر آ رہی تھی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور سوچا۔ بندوں کی جنت تو آباد ہو گئی ہے، خدا کی جنت بھی کیا اتنی ہی آباد ہو گی؟ بے اختیار میری نظر اپنی اہلیہ اور

ماہ رخ پر پڑی جو پوری طرح حجاب میں تھیں ۔ بلال کے چہرے پر پڑی جو ہر وقت اس فکر میں رہتا تھا کہ مجھ سے کوئی دینی سوال کر لے ۔ اپنے بیٹے پر پڑی جس پر ابھی نماز فرض بھی نہ ہوئی تھی ، مگر وہ میرے ساتھ ساری نمازیں پڑھ رہا تھا۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔ خدا کی جنت اتنی غیر آباد نہیں ہوگی ۔

مگر ڈوبتے سورج کے ساتھ ایک دوسری فکر نے مجھے آلیا۔ یہ جو اتنے سارے لوگ خدا سے غافل اور آخرت سے غافل جی رہے ہیں ، جب مر کے خدا کے حضور پیش ہوں گے تو بے شک ان حقائق کو دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹ جائیں گی ۔ مگر یہ اپنے جاننے والے ہر مسلمان کا گریبان پکڑ کر ضرور پوچھیں گے کہ تم نے ہمیں اس دن اور اس دنیا کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔ کچھ نہیں تو خدا کا کلام یعنی قرآن مجید ہی ہم تک پہنچا دیتے ۔ میرے سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ مسلمان اپنے ان جاننے والے غیر مسلموں کو اُس روز کیا جواب دیں گے؟

نگاہوں کو پالینے والا

کافی وقت ماہانکون کی عظیم الشان بلڈنگ کی چھت پر گزار کر ہم واپسی کے لیے روانہ ہوئے ۔ اصل لفٹ تک جانے کے لیے ہمیں دو تین منزل نیچے اترنا تھا۔ آتے وقت اس کے لیے ایک اور لفٹ استعمال کی تھی مگر جاتے وقت یہ سفر سیڑھیوں سے کرنا تھا۔ یہ گول سیڑھیوں تھیں اور عمارت کے شیشوں سے پورا شہر نظر آ رہا تھا۔ مرکزی لفٹ نیچے اترنے لگی تو اس کے شیشوں پر شہر کا منظر نمودار ہوا اور ایک دفعہ پھر یہ اڑن کھٹولہ بن گئی ۔ یہ اڑن کھٹولہ شام کے منظر کے ساتھ چھاؤ پھریا دریا کے اوپر سے اڑنا شروع ہوا۔ پھر رات کے منظر کے ساتھ شہر کی جگمگاتی عمارات ہمارے سامنے تھیں ۔ کچھ لمحوں میں ماہانکون کی بلند عمارت سامنے آ گئی جس سے پھوٹتی مختلف رنگوں کی روشنیاں اور کرنوں کا منظر بڑا ہی دیدہ زیب تھا۔ اسی اثنا میں لفٹ سطح زمین پر پہنچ کر رک گئی اور منظر ختم ہو گیا۔

یہ بنکاک میں ہماری آخری رات تھی ۔ گرچہ ہمیں دیگر شہروں سے ہو کر پھر بنکاک آ کر رکنا

تھا،مگر بلال کو اپنی کمپنی کی طرف سے فلپائن جانا تھا اور ماہ رخ کو بھی وہ ساتھ لے جا رہے تھے۔ یوں یہ ان کے ساتھ ہماری آخری ملاقات تھی۔ ماہ رخ نے آج ہمارے لیے کڑاہی گوشت بنایا تھا اور کھانا انھی کے گھر جا کر کھانا تھا۔مگراس سے قبل بلال کے ساتھ اپنے ہوٹل جا کر میں نے اپنا ایک سوٹ کیس لیا جس میں میرا وہ سامان تھا جسے آسٹریلیا لے کر جانا تھا۔ یہ سوٹ کیس ہم ان کے گھر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ کیونکہ اگلی منازل میں یہ اضافی سامان لے کر گھومنا ایک غیر ضروری بوجھ ہوتا۔ بلال نے اپنے گھر کی چابی مجھے دے دی تھی تا کہ واپسی میں ان کی غیر موجودگی میں اپنا سامان ان کے گھر سے لے سکوں۔

کافی دیر ان کے گھر پر گزار کر ہم رات بارہ بجے اپنے ہوٹل کے لیے روانہ ہوئے۔ ماہ رخ اور بلال ٹک ٹک یعنی اس بڑے سے رکشے میں ہمیں اپنے اپارٹمنٹ سے مرکزی سڑک تک چھوڑنے آئے جس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے،اور بہت اداسی کے ساتھ ہمیں الوداع کہا۔ یہ بظاہر ہماری آخری ملاقات تھی۔مگر عالم الغیب رب العالمین کو اس وقت بھی پتہ تھا کہ بنکاک واپس آ کر ایک دفعہ پھر ان دونوں کے ساتھ ہی وقت گزرے گا۔

ٹک ٹک سے اتر کر ہم پیدل اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔اس وقت بارہ بج چکے تھے اور راستہ بالکل سنسان تھا۔ اس سنسان راستے پر جاتے ہوئے مین روڈ تک ہمیں صرف دو افراد ملے۔ یہ دونو جوان لڑکیاں تھیں جو ہر خوف وخطرے سے نیاز اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہی تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ کیا ہمارے معاشرے میں کوئی نوجوان لڑکی تنہا اور سنسان راستے پر رات کے بارہ بجے اس طرح بے خوف اپنے گھر جا سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے۔

اس مسئلے کی وجہ بہت سادہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہماری اخلاقی تربیت کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ جو کچھ تربیت ہے وہ لڑکیوں کے لیے ہے۔لڑکوں کی تربیت ہمارے کرنے کا کوئی کام نہیں۔کوئی انھیں نہیں بتاتا کہ خواتین کو کوئی حکم دینے سے قبل اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی نگاہوں کو

نیچے رکھنے کا حکم دیا ہے۔اور یہ حکم اس ہستی نے دیا ہے جو ہر جگہ موجود ہوتا ہے، چاہے نگاہیں اس کو نہ پا سکیں۔مگر وہ اتنا عظیم ہے کہ دیکھنے والے کی نگاہوں کے بارے میں جان لیتا ہے کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے۔نظروں کا ہر زاویہ بد اور نگاہوں کی ہر آوارگی اس کے علم میں ہوتی ہے۔اور ایک روز وہ ہر ہر چیز کا حساب لے گا۔ یہ احساس جس معاشرے میں پیدا ہو جائے وہاں سنسان راستوں پر رات کے بارہ بجے تنہا جوان لڑکیاں نہ صرف اپنے گھروں کو باحفاظت لوٹ سکتی ہیں بلکہ اس کا بھی یقین رکھ سکتی ہیں کہ کوئی آوارہ نظر ان کو دیکھنے کے لیے نہیں اٹھے گی۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

اگلی صبح ہماری روانگی تھی۔ہم ناشتہ کر کے ٹیکسی سے ائیر پورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔یہ ٹیکسی ماہ رخ نے آن لائن ہمیں بک کرا دی تھی جو وقت مقررہ پر پہنچ گئی تھی۔مگر سفر کے شروع ہی میں سکم وت روڈ پر ٹیکسی ٹریفک میں پھنس گئی۔ بلال ہمیں یہ بتا چکے تھے کہ بنکاک دنیا کے بہت زیادہ ٹریفک جام والے شہروں میں سے ایک ہے۔ہم نے پچھلے دنوں سکم وت پر ٹریفک جام کے یہ مناظر خود دیکھے تھے۔تاہم تھائی لوگوں میں اتنی زیادہ برداشت تھی کہ کتنا بھی ٹریفک جام ہو وہ اپنی لائن توڑ کر کبھی برابر والی لائن میں نہیں جاتے تھے چاہے وہ خالی پڑی ہے۔ائیر پورٹ جاتے ہوئے ہمارے ساتھ یہی مسئلہ ہو چکا تھا۔ہمیں دائیں طرف ہائی وے پر چڑھنے کے لیے مڑنا تھا اور اس لائن میں گاڑیوں کی ایک طویل قطار تھی۔اس طرف کا سگنل چند لمحوں کے لیے کھلتا، چند گاڑیاں آگے بڑھتیں اور پھر رک جاتیں۔ جبکہ برابر کی لائن بالکل خالی تھی جس سے لوگ سیدھے آگے کی طرف جا رہے تھے۔

کافی دیر جب ہم پھنسے رہے اور اندیشہ ہونے لگا کہ فلائٹ ہی نکل جائے گی تو میں نے ڈرائیور کو مسئلہ سمجھایا۔دراصل ہماری فلائٹ کم کرایہ والی وہ فلائٹ تھی جو ہم نے کافی پہلے آن لائن بک کرالی تھی۔اس کا ٹکٹ بہت سستا تھا لیکن اس میں وقت پر پہنچنا شرط ہوتا ہے۔نہ پہنچے تو

سارے پیسے ڈوب گئے۔ اب یہی صورتحال ہمارے لیے پیدا ہو چکی تھی۔

ان لوگوں کو انگریزی تو بالکل نہیں آتی لیکن ڈرائیور اتنا سمجھ گیا کہ ہمیں بہت دیر ہو رہی ہے۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ ہمیں نقصان سے بچانے کے لیے اب اسے روایت کی خلاف ورزی کرنی ہوگی۔ چنانچہ اس نے لائن سے اپنی ٹیکسی نکالی، برابر والی خالی لائن پر ڈالی اور ایک منٹ سے کم میں وہ سگنل کے پاس پہنچ گیا۔ جب کہ اس سے قبل نصف گھنٹے میں ہم بمشکل چند سو گز ہی آگے بڑھے ہوں گے۔ مگر ہمیں دیکھ کر کسی شخص نے وہ کام کرنے کی کوشش نہیں کی جو ہمارے ڈرائیور نے کیا تھا۔ ان لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ان کو کوئی ایمرجنسی ہے۔

اگر سب لوگ ہماری پیروی کرتے تو پھر سیدھا جانے والوں کا راستہ بھی بند ہو جاتا اور دائیں مڑنے والے سگنل پر بھی ٹریفک جام ہو جاتا۔ اس لیے سب لوگ تحمل سے کھڑے رہ کر اپنی باری کا انتظار کرتے رہے۔ مگر ہم تیزی سے سگنل کراس کر کے ہائی وے پر چڑھ گئے جہاں آگے روڈ خالی تھا اور الحمد للہ ہم وقت مقررہ پر ائیر پورٹ پہنچ گئے۔

یہ میرے لیے ایک عجیب وغریب مشاہدہ تھا۔ یہ تھائی لوگوں کے صبر کا عجیب منظر تھا۔ ایک طرف تو اپنی لائن میں کھڑے رہنے کا صبر اور دوسری طرف ایک اور گاڑی کو خلاف ورزی کرتے دیکھنے کے باوجود نہ کسی نے برا بھلا کہا اور نہ اس کی پیروی کی۔ سب اس مفروضے پر رہے کہ ان کا واقعی کوئی مسئلہ ہوگا۔

میں نے سوچا کہ یہ اگر پاکستان میں ہوا ہوتا تو کیا ہوتا۔ اول تو کسی نے اپنی لائن میں کھڑے ہی نہیں رہنا تھا بلکہ دائیں بائیں گاڑی گھماتے ہوئے جہاں سے جگہ ملتی آگے بڑھتے چلے جانا تھا۔ اس کے نتیجے میں ٹریف سگنل پر زبردست ٹریفک جام ہوتا اور سیدھا جانے والوں کا راستہ بھی بند ہو جاتا۔ یہ پاکستان میں ہمارا روزہ مرہ کا مشاہدہ ہے۔ دوم یہ کہ اگر کوئی شخص کسی انتہائی مجبوری کی وجہ سے لائن بدل لیتا تو گالیوں اور بدزبانی کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

یہ ہیں ہمارے حقائق جن سے ہم سب واقف ہیں۔ اور یہ سب کچھ کر کے ہم جب گھر پہنچتے

ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ ٹی وی کے آگے لیٹ کر چینل بدلتے رہتے ہیں۔ یعنی کوئی ایمرجنسی نہیں ہوتی بلکہ طبیعت میں جلد بازی اور عدم برداشت اس طرح شامل ہو چکے ہیں کہ بلاوجہ ہر قانون اور روایت کی دھجیاں بکھیر کر سب لوگوں کے لیے مصیبت کا باعث بنتے ہیں اور اپنی اور دوسروں کی جان اور مال خطرے میں ڈالتے ہیں۔

ہم اس حال کو خود بخود نہیں پہنچے۔ اس کے پیچھے ہماری وہ تربیت ہے جس میں صبر وتحمل کو دور دور تک کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہمارا سب سے بڑا المیہ تربیت کے اداروں کا تباہ ہو جانا اور تربیت کی اساسات کا بدل جانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اول تو ہم اپنے لوگوں کی کسی قسم کی تربیت نہیں کرتے۔ ان کی کردار سازی کو گھر، اسکول اور قومی سطح پر کرنے کا کوئی کام نہیں سمجھا جاتا اور اگر کہیں تربیت ہے تو اس کی اساس صبر، تحمل اور دیگر اخلاق عالیہ کے بجائے یہ ہے کہ لوگوں کا ظاہری حلیہ بدلیں یا جذباتی انداز فکر کو ان پر غالب کر دیں۔ اس کے بعد وہی قوم جنم لیتی ہے جو اس وقت ہمیں اپنے ملک میں نظر آتی ہے۔ ہم ادارہ انذار کے تحت اسی اندوہناک صورتحال کو بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اللہ نے چاہا تو آنے والے برسوں میں اس ادارے سے بہت خیر پھیلے گی۔

ہمارے سفر کے اگلے مقامات

تھائی لینڈ خشکی کے اس عظیم قطعے کے آخری حصے میں واقع ہے جو شمال میں روس سے شروع ہوتا ہے اور جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے وسط ایشیا، برصغیر اور چائنا سے ہوتا ہوا کمبوڈیا اور تھائی لینڈ پر آ کر ختم ہوتا ہے۔ یہاں سے وہ عظیم سمندری سلسلے شروع ہوتے ہیں جو ایک طرف بحر ہند اور دوسری طرف بحر الکاہل سے جا ملتے ہیں۔ تھائی لینڈ پر جہاں یہ خشکی کا عظیم قطعہ ختم ہو رہا ہے، خشکی کی ایک پٹی سیدھی جنوب کی سمت آگے بڑھتی ہے جس کے ایک طرف خلیج تھائی لینڈ اور دوسری طرف بحیرہ انڈومن واقع ہے۔ یہ گویا ایک جزیرہ نما ہے جس کے تین طرف پانی اور ایک طرف سے یہ پٹی تھائی لینڈ سے جڑی ہے۔ یہ پٹی شروع میں کچھ پتلی اور آگے جا کر چوڑی

ہو جاتی ہے۔اس چوڑی پٹی پر ملیشیا واقع ہے اور اس کی نوک پر جنوب کی سمت سنگاپور واقع ہے۔ جبکہ شروع کا حصہ تھائی لینڈ میں شامل ہے۔اسی حصے میں ایک جگہ بحیرہ انڈومن کا پانی زمین کو چیرتا ہوا اندر آ گیا ہے۔ یوں اس پانی کے ایک طرف زمین کی وہ پٹی ہے جس پر آگے بڑھ کر ملیشیا آ جاتا ہے۔ کرابی جو ہماری اگلی منزل تھی اسی پٹی پر واقع ساحلی علاقہ ہے۔اس کے بالکل مخالف سمت پھوکٹ کا ساحلی شہر ہے۔ جبکہ ان دونوں کے بیچ پانی میں فی فی کا جزیرہ ہے۔ یہی تین جگہیں ہمارے سفر کی اگلی تین منازل تھیں جو تھائی لینڈ کے مشہور ترین تفریحی مقامات ہیں۔

اجتماعی خیر و برکت کا اصول

ہم بنکاک سے کرابی کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ہم تقریباً ایک گھنٹے کی فلائٹ کے بعد کرابی پہنچے۔ائیر پورٹ ہم الحمدللہ بروقت پہنچ گئے تھے۔ میں نے آن لائن چیک ان کرالیا تھا، اس لیے بورڈنگ میں بھی مسئلہ نہیں ہوا۔ میں نے آن لائن ایک ٹیکسی بک کرالی تھی کہ ائیر پورٹ کے لیے مشکل نہ ہو۔مگر وہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ بہت ساری ٹیکسی سروس کے کاؤنٹر لاؤنج سے نکلتے ہی بنے ہوئے ہیں۔مگر یہ کرنا خود ایک مسئلہ بن گیا کیونکہ ہمیں لینے کے لیے کوئی ٹیکسی موجود نہ تھی۔ میں چونکہ پیسے دے چکا تھا اس لیے اب اس کا تلاش کرنا ضروری تھا۔مگر یہاں زبان کا بھی ایک مسئلہ تھا کیونکہ تھائی لوگ انگلش نہیں سمجھتے تھے۔

ایسے میں ایک ٹیکسی کاؤنٹر پر موجود خاتون نے بہت مدد کی۔ اس نے ہمیں اپنی ٹیکسی کی پیشکش کی تھی، مگر جب میں نے اپنا مسئلہ بتایا تو اس نے مجھ سے میری ٹیکسی والوں کا فون نمبر لے کر ان سے بات کی اور پھر مجھے بتا دیا کہ آپ بیٹھ جائیں وہ پانچ دس منٹ میں آ جائیں گے۔ میں نے بنکاک سے مقامی سم لے لی تھی۔ اس لیے میرے پاس مقامی کال کرنے کی سہولت موجود تھی۔ مگر اس وقت میں مجھے احساس ہوا کہ اس خاتون نے میری کافی مشکل حل کی

ہے۔ خاص طور پر اس پس منظر میں کہ میں متوقع طور پر ان کی ٹیکسی کا گاہک تھا اور میں نے کسی اور سے بکنگ کرالی تھی۔ مگر اس نے اس بات کا سوچے بغیر اپنا کام چھوڑ کر میری مدد کی تھی۔ حالانکہ اس وقت دیگر مسافر فلائٹ سے اتر رہے تھے اور اس کی دلچسپی اس بات میں ہونی چاہیے تھی کہ ان کو اپنی ٹیکسی سروس فراہم کرے۔ لیکن اس نے میری مدد کرنا ضروری سمجھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنا نفع نقصان سوچے بغیر دوسروں کی مدد کرتے ہیں، وہ اعلیٰ ترین انسان ہوتے ہیں۔ جس معاشرے میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں وہاں خیر و برکت جنم لیتی ہے۔ جہاں لوگ صرف اپنے مفادات کے لیے زندگی گزاریں وہاں سے ہر خیر و برکت اٹھ جاتی ہے۔ چاہے ایسی قوم اپنے ملک کے نام کے ساتھ اسلامی جمہوریہ لکھ دے۔ چاہے اپنے آئین میں قرارداد مقاصد لکھ ڈالے۔ چاہے اس کے لیڈر دنیا بھر میں اسلام کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں۔

کرابی اور ہمارا ہوٹل

کچھ دیر انتظار کے بعد ہمارا ٹیکسی والا آ گیا اور ہم اس کے ساتھ اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاز سے کرابی درختوں سے ڈھکے ایک جنگل کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ائیر پورٹ سے کچھ دور چلنے کے بعد ہم اسی جنگل سے گزرنا شروع ہو گئے۔ جنگل کے علاوہ یہاں دوسری نمایاں چیز لائم اسٹون یعنی چونے کے پتھر کی چٹانیں تھیں۔ یہ زمین سے ہزار فٹ یا اس سے کم و بیش بلند پہاڑ تھے جن پر لگے درختوں کی وجہ سے ان کا رنگ بھی سبز نظر آ رہا تھا۔

ایک گھنٹے کی خوبصورت ڈرائیو کے بعد ہم اے او نانگ کی ساحلی پٹی کے پاس پہنچے جہاں ہمارا ہوٹل تھا۔ یہ ساحلی علاقہ بھی پہلے پورا جنگل تھا، مگر اس پورے علاقے میں ہوٹل بنانے کی غرض سے جنگلات کو صاف کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک خوبصورت اور صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ ہمارہ کمرہ

کافی کشادہ تھا جس سے نیچے بنے سوئمنگ پول کا منظر بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ جبکہ پچھلی سمت میں اس جنگل کا کچھ حصہ موجود تھا جو کٹنے سے رہ گیا تھا۔ ہوٹل ایک بازار کے قریب بارونق مگر پرسکون علاقے میں واقع تھا۔ یہاں پیچھے ہی مشہور نائٹ بازار لگتا تھا جس میں کھانے پینے اور مختلف اشیائے خورونوش کی دوکانیں تھیں۔ ایک روز ہم اس نائٹ بازار بھی گئے۔ یہاں کی ایک دلچسپ بات یہاں موجود ایک ہوٹل تھا جس کا نام ''بری طرح'' تھا۔ جی ہاں یہی اس ہوٹل کا نام تھا یا کم از کم انگریزی الفاظ کا اردو تلفظ یہی بن رہا تھا۔ بعد میں اس کا ہم قافیہ ہوٹل بھی قریب ہی مل گیا۔ یعنی ''اری طرح'' ہوٹل۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ کسی کا خاندانی نام ہے اور شاید یہ دو بھائیوں کے دو ہوٹل ہیں۔

ہم چونکہ فجر سے اٹھے ہوئے تھے اور اس وقت دوپہر ہو چکی تھی، اس لیے کچھ دیر سو گئے۔ غروب آفتاب سے ذرا پہلے ہم علاقہ دیکھنے نکلے تو ساحل کے سامنے کھانے پینے کے اسٹالوں کی طویل قطار تھی۔ کان میں بہت سے مسلمان بھی تھے۔ کرابی میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔ شاید یہ ملیشیا سے قریب ہونے کا اثر تھا۔ اس کے علاوہ یہاں کافی انڈین ریسٹورنٹ بھی تھے جن میں حلال غذا مل جاتی تھی۔ اس لیے یہاں کھانے کا اتنا مسئلہ نہ تھا۔ اسی بنا پر ماہ رخ کے مشورے سے میری اہلیہ نے کرابی کو اپنے پروگرام میں شامل کیا تھا۔ گوکہ یہ ابتدا میں ہمارے سفر میں شامل نہ تھا۔

تھائی لینڈ کا یہ سفرنامہ ابھی ناتمام ہے۔ یہ سفرنامہ مکمل کتابی شکل میں اور اس کے ساتھ مزید آسٹریلیا کا سفرنامہ ان شاءاللہ نومبر 2019 میں شائع ہوگا

ابو یحییٰ کے ناول

جو آپ کی سوچ، زندگی اور عمل کا محور بدل دیں گے

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر، جو سچ کی تلاش میں نکلی تھی

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

خدا بول رہا ہے

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجئے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھئے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

کراچی کے لیے 500، بیرون کراچی کے لیے 400 روپے کا منی آرڈر ہمارے پتے پر ارسال کیجئے......یا ایک پے آرڈر/بینک ڈرافٹ بنام ''ماہنامہ انذار'' بینک الفلاح المحدود (صدر برانچ)
اکاؤنٹ نمبر 0171-1003-729378 کے نام بھجوائیے
رسالہ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے
2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوائیے
3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

ایجنسی لینے کا طریقہ کار:

ایجنسی کے لیے ہر ماہ کم از کم پانچ رسالے لینا ضروری ہے
ایجنسی کا ڈسکاؤنٹ **20** فیصد ہے
ایجنسی لینے کے لیے اوپر دیئے گئے پتے پر رابطہ کیا جا سکتا ہے

ابو یحییٰ کا نیا چوتھا ناول شائع ہوگیا ہے

”خدا بول رہا ہے“

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

”جس طرح کسی انسان کو اپنی کوئی اولاد بری نہیں لگتی البتہ بعض بچے دوسروں سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں، اسی طرح ایک مصنف کو اپنی بعض تصنیفات زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ یہ قاعدہ اگر ٹھیک ہے تو ”خدا بول رہا ہے“ کی صورت میں اس دفعہ قارئین کی خدمت میں ایک ایسا ناول پیش ہے جس کے متعلق اس خاکسار کا خیال ہے کہ یہ اپنے پیغام کے لحاظ سے بہت موثر اور کہانی کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہے۔ یہ اس مصنف ہی کا نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کا بھی خیال ہے جن کی خدمت میں اسے ابتدائی فیڈ بیک یا اسکریننگ کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ اس لیے امید ہے کہ قارئین اس ناول کو پچھلے ناولوں سے زیادہ مفید اور دلچسپ پائیں گے۔“

ابو یحییٰ

قیمت 350 روپے

رسالے کے قارئین رعایت کے ساتھ گھر بیٹھے حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں:

رابطہ : 0332-3051201, 0345-8206011

ای میل: globalinzaar@gmail.com

web: www.inzaar.pk

Monthly
INZAAR
SEP 2019
Vol. 07, No. 09
Regd. No. MC-1380
Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,
25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi